ستمبر ۱۹۶۶ء

جلد ۶۶ — عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۶	ستمبر ۱۹۶۶ء	عدد ۱

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور	اس شمارے کی قیمت
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور	ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دنیائے اسلام کی نہایت معروف دینی جماعت "الاخوان المسلمون" کو مصر کے فرمانروا صدر ناصر جس بیدردی کے ساتھ نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں وہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی داستان نہیں جس سے دنیا ناواقف ہو۔ سابق شاہ فاروق نے سب سے پہلے اس تحریک کے داعیٔ اوّل جناب حسن البنا علیہ الرحمہ کو دن دہاڑے برسرِعام شہید کروایا۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد جب مسندِ اقتدار کرنل ناصر کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے ۵۴ء میں اس تحریک کے ہزاروں آدمیوں کو تختۂ مشقِ ستم بنایا، متعدد بیش قیمت شخصیتوں کو پھانسی کی سزا دی جن میں التشریع الجنائی الاسلامی (اسلامی قانون فوجداری) کے فاضل مصنف شیخ عبدالقادر عودہ بھی شامل تھے۔ اب پھر اس خادمِ دین جماعت پر ظلم و ستم کا ایک نیا چکر چلا ہے جس میں سینکڑوں عورتوں اور ہزاروں مردوں کو پکڑا گیا۔ ان کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ کئی اصحاب کو عمر قید اور طویل قید کی سزائیں دی گئیں جن میں حسن الھضیبی جیسے فاضل بزرگ اور حمیدہ قطب اور زینب الغزالی جیسی محترم خواتین بھی شامل ہیں، اور اب تین بے گناہوں کو پھانسی دے دی گئی ہے جن میں العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، اور فی ظلال القرآن جیسی بے نظیر کتابوں کے مصنف استاذ سید قطب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مرحوم شہیدوں کی قربانیاں قبول فرمائے، ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، اور جو مظلوم زندہ ہیں ان کی دادرسی فرمائے۔

مصر کی کڑی سنسرشپ کے پردے سے جو اندوہناک خبریں چھن چھن کر وقتاً فوقتاً اخبارات میں آتی رہی ہیں وہ حالات کی یہ تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں کہ ظلم و استبداد کا طوفان مختلف

اوقات میں ایک ہی انداز کے ساتھ اٹھتا ہے، پھر ایک ہی رفتار کے ساتھ بڑھتا ہے اور اپنے پیچھے ایک ہی طرح کے المناک اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ ہر بار یوں ہوتا ہے کہ دفعتاً اخباراتِ میں "سنسنی خیز" خبر آتی ہے کہ عزت مآب صدر ناصر اور ان کے حواریوں کی قیمتی زندگیاں خطرے میں ہیں اور حکومتِ وقت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ عین وقت پر یہ سازش پکڑ لی جاتی ہے، ہتھیار برآمد ہونے کی اطلاعات دی جاتی ہیں، دنیا کو سنایا جاتا ہے کہ اس خفیہ سازش کے پیشِ نظر کن کن لوگوں کو قتل کرنے اور کن کن عمارتوں کو ڈھانے کا منصوبہ تھا، اور بتایا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے الاخوان المسلمون کی قوت کام کر رہی ہے۔ اس کے بعد عدالت کا ڈرامہ شروع ہوتا ہے جس میں خوب دل کھول کر انصاف کے تمام معروف و مسلّم اصولوں کی مٹی پلید کی جاتی ہے اور پھر وہاں سے چند نہایت قیمتی جانوں کو تختۂ دار پر لٹکانے کا حکم صادر ہوتا ہے، ایک اچھی خاصی تعداد کو عمر قید اور طویل قید کی سزا کے احکام ملتے ہیں اور مجبور و مقہور اخوانیوں کی عظیم اکثریت جیلوں میں ٹھونس دی جاتی ہے۔ پھر قید کی حالت میں اُن کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک ہوتا ہے اُس کے تصور سے انسان کی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔

ان بیچاروں کے معاملے میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جاتا ہے اس کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بیان کا لفظ بلفظ ترجمہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ غیر جانبدار اور بے لاگ انصاف پسندوں کا ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جس نے دنیا کے مختلف ملکوں میں ہونے والی بے انصافیوں کو روکنے کے لیے بارہا جد و جہد کی ہے، اور جس کی غیر جانبداری پر آج تک کوئی حرف نہیں رکھ سکا ہے۔ اس ادارے کا بیان حسبِ ذیل ہے:

"۲۴ مارچ ۱۹۶۴ء کو ایک قانون شائع کیا گیا جس کی رُو سے متحدہ عرب جمہوریہ کی حکومت نے صدر کو یہ اختیار دیا کہ جن اشخاص پر سیاسی جرائم کا الزام لگایا گیا ہو انہیں وہ مقدمہ چلائے بغیر قید میں رکھ سکتے ہیں۔

نیز یہ کہ ایسے سیاسی ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے ایک خاص ٹریبونل قائم کیا جائے گا جس کے ارکان خاص اسی کام کے لیے صدر کی طرف سے نامزد کیے جائیں گے۔ عملاً اس ٹریبونل نے ایک فوجی عدالت کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس پر صرف یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ اس کے فیصلوں کے نفاذ کے لیے صدر کی توثیق ضروری ہوگی۔

جنوری میں اس ٹریبونل کی کارروائیوں کے دوران ایک مقدمہ میں، اور پھر فروری میں دو مزید مقدمات میں ملزموں نے یہ شکایت کی کہ ان سے اقرار جرم کرانے کے لیے ان کو سخت عذاب دیا گیا ہے" تازہ کارروائی کے دوران یہی شکایت سید قطب نے بھی کی جو سب سے بڑے ملزم ہیں۔ ٹریبونل کے صدر نے فوراً ان کو خاموش کرا دیا اور اس شکایت کے حق میں کوئی شہادت سننے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سب گواہ جھوٹے ہیں۔

دا ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنے ایک اور تحریری بیان میں کہا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک متعدد ملزم ایسی حالت میں پیش ہوئے کہ وہ جسمانی یا ذہنی حیثیت سے مقدمہ کی کارروائی میں حصہ لینے کے قابل نہ تھے،

سید قطب اور اخوان المسلمون کے دوسرے افراد کو اپنی مدافعت کے لیے اپنے حسبِ منشا وکلاء کی خدمات حاصل کرنے کا موقع حاصل نہ تھا۔ فروری میں دو سوڈانی وکلاء چند ملزموں کی پیروی کے لیے ہوائی جہاز پر قاہرہ پہنچے۔ نومبر ۱۹۶۵ء میں عرب وکلاء کی کانگریس یہ ریزولیوشن پاس کر چکی تھی، مصری بار ایسوسی ایشن اس کی تائید کر چکی تھی، اور خود مصری قانون میں اس کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قاہرہ کی عدالتوں میں سوڈانی وکلاء پیش ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سوڈانی وکیلوں کو کوئی وجہ بتائے بغیر قاہرہ سے نکال دیا گیا اور انہیں اپنے موکلوں سے ملنے تک نہ دیا گیا۔

جس وقت پہلی مرتبہ تعذیب کی شکایت ٹریبونل کے سامنے پیش کی گئی اس کے بعد

فوراً ہی پریس اور پبلک کو عدالتی کارروائی سننے سے روک دیا گیا اور پھر سرکاری کنٹرول کے تحت ایک چھلنی سے چھن چھن کر ہی ٹریبونل کی کارروائی کی خبریں باہر آتی رہیں۔ مسٹر آرچر (امینسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے) بھی مقدمہ کی کارروائی نہ سن سکے۔ البتہ ہمیں اس مہربانی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مسٹر آرچر کی درخواست پر جس زمانے میں غور کیا جا رہا تھا اس زمانے میں ان کو قاہرہ میں ٹھیرنے کی اجازت دے دی گئی۔

ملزموں کے قصور وار یا بے قصور ہونے کے بارے میں کوئی اظہار رائے کیے بغیر امینسٹی انٹرنیشنل گہرے افسوس کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ ان مقدمات کی کارروائی جس طرح ہوئی ہے وہ تعذیب کی شکایات کو تقویت ہی پہنچا سکتی ہے اور مصری انصاف کے متعلق جانبداری کا شبہ پیدا کرتی ہے۔ امینسٹی انٹرنیشنل مصری حکومت سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ملزموں کے بنیادی انسانی حقوق کا احترام کرے اور منصفانہ طریقے سے مقدمہ چلا کر اپنی بین الاقوامی شہرت میں اضافہ کرے۔"

یہ ہے اُس انصاف کی حقیقت جس کے مطابق الاخوان المسلمون کے ارکان کو مجرم گردان کر انہیں شدید ترین سزائیں دی گئی ہیں۔

مصر اَور اِخوان

(خلیل حامدی)

ناصر اور اخوان کی کشمکش، جو ۱۹۵۴ء سے چلی آرہی ہے، اب پھر انتہائی افسوسناک مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں اخوان کے چھ سرکردہ رہنما تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے تھے، اور اب دوبارہ تین افراد کو پھانسی دے دی گئی ہے، جن میں نمایاں شخصیت سید قطب کی ہے۔ ان پر الزامات کی لمبی فہرست ہے لیکن سب سے بڑا اور ہولناک الزام یہ ہے کہ وہ صدر ناصر کو قتل کرنا چاہتے تھے اور طاقت کے بل پر ملک میں خونی انقلاب برپا کرنے کی اسکیم تیار کر رہے تھے۔ ان الزامات کی حقیقت کیا ہے اور اخوان کی طرف سے ان الزامات کا کیا جواب دیا گیا ہے، ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالنے سے پہلے ان اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہے جو درحقیقت اس کشمکش کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں مصری حکومت نے اپنی خارجہ سیاست کو جس ڈھب پر چلایا ہے، مصر کے سنجیدہ اور محبِ وطن طبقے اس سے خوش نہیں ہیں بلکہ یہ ناخوشی سخت غیظ و غضب اور اضطراب و ہیجان میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ مصری قوم اسلام کی نام لیوا ہے، اسلامی تاریخ سے اُس کا گہرا رشتہ ہے، اسلامی علوم کا صدیوں سے وہاں چرچا ہے۔ دنیائے اسلام کے ساتھ ہمیشہ اس کے روابط رہے ہیں، ماضیٔ قریب میں اس کے اندر مُصلحین اور اہلِ علم و دعوت کی طاقتور جماعت گزر چکی ہے، شہری آبادی کے مخصوص حلقوں کو چھوڑ کر عام آبادی، جس میں اکثریت دیہاتی فلاحین کی ہے اسلام سے شدید وابستگی رکھتی ہے اور اس کی معاشرتی زندگی میں اسلامی روایات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

اس مسلمان قوم کو جس خارجہ سیاست سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ یہ ہے :-

جہاں تک دنیائے اسلام کے مسائل و مشکلات کا تعلق ہے مصر کی خارجہ سیاست، ان کو اسلام یا مسلمانوں کے مسائل کی حیثیت سے نہیں دیکھتی بلکہ ان کیمپوں کی مصلحت کی عینک سے دیکھتی ہے جن کی حاشیہ برداری کا اُسے شرف حاصل ہے، اور یا پھر وہ مصری حکام کی ذاتی اغراض و مصالح کے تابع ہے۔ اس غلط نگاہی نے مصر کی سیاستِ خارجہ کو بے اصول اور ابن الوقت بنا کر رکھ دیا ہے۔

ایک طرف مصری حکومت اسرائیل کی دشمنی کو اپنا اوّلین و آخرین مقصد قرار دیتی ہے، مگر دوسری طرف ان ممالک سے اُس کی گاڑھی چھنتی ہے جنہوں نے نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے بلکہ اس کی ترقی و توسیع کے لیے کوشاں ہیں۔ یوگوسلاویہ سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ حبشہ کے ہیلا سلاسی سے انتہائی دوستانہ ربط ضبط ہے، حالانکہ یہ شخص مسلمانوں کا قاتل ہے اور اسرائیل کے لیے افریقہ کی زمین ہموار کر رہا ہے۔ اریٹریا کی مسلم آبادیوں میں اس نے کئی اسرائیلی کمپنیوں کو کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے۔ ایک مرتبہ امریکی کانگرس میں اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں آئندہ بیس سال میں اُن تمام حبشی مسلمانوں کو عیسائی بنا دوں گا جو میری مملکت میں رہتے ہیں"۔ مکاریوس مصری حکومت کی نگاہ میں اس قدر عزیز ہے کہ ترکی کے خلاف اُسے جنگی اسلحہ تک کی امداد دی گئی۔ اور اب حال ہی میں نقوسیا سے اعلان ہوا ہے کہ اگر ترکی نے قبرص پر حملہ کیا تو اس کی جوابی کارروائی کے لیے مصر کے راکٹ مدد کے لیے پہنچیں گے۔ مکاریوس کی شخصیت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے، اسی نے قبرصی ترکوں کو بیدردی کے ساتھ قتل کیا ہے، اور یہ درحقیقت آرتھوڈکس کلیسا کی آڑ میں برطانوی استعمار کی خدمت کر رہا ہے۔ مکاریوس نے جب مصر کا دورہ کیا تھا تو اس نے صدر ناصر کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "موصوف ہمارے ساتھ بڑی ملنساری سے پیش آئے، حتیٰ کہ گفتگو میں انہوں نے فلسطین کے مسئلہ کا ذکر تک نہیں کیا"۔ اسی طرح مصری حکومت بھارت کے ساتھ دوستانہ روابط کا اس قدر لحاظ کرتی ہے کہ بھارت نے پاکستان پر جارحانہ حملہ کر دیا مگر اس کے جواب میں مصری حکومت مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہی۔ بلکہ کاسابلانکا میں منعقد ہونے والی عرب سربراہوں کی کانفرنس میں اس کا موقف یہ تھا کہ ویت نام پر تو قرارداد پاس ہونی چاہیے مگر

کشمیر کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس کانفرنس کے بعض دوسرے ممبر اس غلط پالیسی کے مقابلے میں نہ ڈٹ جاتے تو یہ کانفرنس مسئلۂ کشمیر اور پاکستان پر بھارتی حملے جیسے عظیم حادثہ پر سرے سے کوئی تبصرہ کیے بغیر برخاست ہو جاتی

مصری حکومت اور مصری حکمرانوں کے نامناسب تصرّفات نے شام کو ہمیشہ کے لیے تاریک مستقبل کے حوالے کر دیا۔ شام نے مصر کے ساتھ جو جذبہ انگیز اتحاد کیا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ شامیوں کی اس عظیم تاریخی قربانی کی قدر کی جاتی اور جن داخلی مشکلات کی وجہ سے انہوں نے مصر کے دامن میں پناہ لی تھی انہیں حل کرنے میں مدد دی جاتی۔ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شام نے کمیونسٹوں کی دراندازیوں سے خائف ہو کر مصر کے ساتھ الحاق کیا تھا۔ مگر مصری حکام نے شام میں جس لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا اُس کی وجہ سے شام کو مصر سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اور اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکا ہوا ہے۔ اس سے پہلے مصر سوڈان کو ضائع کر چکا ہے۔ وادیٔ نیل کے اتحاد کی کمند سرِ بام آ کر ٹوٹ گئی۔ نجیب کے ساتھ مصری حکام کا ظالمانہ سلوک سوڈانی عوام کو مصر سے متنفر کرنے کا سبب بن گیا۔ اور اب مصری حکومت اپنی سابق غلطیوں کی تلافی کے بجائے مزید غلطیوں کا ارتکاب کر رہی ہے۔ چونکہ سوڈان کی موجودہ حکومت مصر سے اتحاد کے حق میں نہیں ہے، اس لیے مصری حکام اُسے زک دینے کے لیے جنوبی سوڈان کے کمیونسٹوں کو اس کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ حکومت سوڈان اُس مصری اسلحہ کا انکشاف بھی کر چکی ہے جو مصر سے جنوبی سوڈان میں داخل ہوا ہے۔

اب یمن کے مسئلے کو لیجیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یمن کا مسئلہ مصری حکومت کی ناروا سیاست کے باعث نہ صرف مصر کے لیے بدنامی کا باعث بن گیا ہے بلکہ اسرائیلی ریڈیو کے الفاظ میں پورے عالمِ اسلام کی پیشانی کا کلنک کا ٹیکہ ہے۔ تین سال سے مصری فوجیں یمن میں بیٹھی ہیں۔ ان تین سالوں میں یمنی قبائل پر انہوں نے جو مظالم توڑے ہیں اُن کی تفصیل الگ رُوداد کی محتاج ہے۔ ان تین سالوں میں مصر اپنی فوجوں پر ایک ارب پونڈ صرف کر چکا ہے اور ابھی تک ۵ لاکھ پونڈ روزانہ

صرف ہو رہے ہیں۔ ایک لاکھ کے لگ بھگ افراد جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں، جن میں دس ہزار سے زائد مصری فوجی ہیں اور باقی یمنی باشندے۔ ایک طرف عرب قومیت کے دعوے اور دوسری طرف عرب بھائیوں کا یہ قتل عام۔ ہر محب وطن کے لیے یہ معاملہ تشویشناک بن چکا ہے۔ مصر کے وہ لوگ خاص طور پر اس جنگ سے سخت بیزار ہیں جن کے سپوت صنعا اور تعز کی پہاڑیوں میں لقمۂ اجل ہوتے ہیں۔ مصری حکومت لاکھ یہ پروپیگنڈا کرے کہ یمن کی جنگ میں مرنے والے "شہید حریت" ہیں، مگر ایک مسلمان کا ضمیر اس بات پر کیسے مطمئن ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلمان کا گلا بھی کاٹے اور شہادت کا درجہ بھی پائے۔ اس صورتِ حال سے پوری عرب دنیا، یمنی عوام اور مصری قوم سراسیمگی میں مبتلا ہے۔ خود مصری فوج بھی اس سے اکتا چکی ہے۔ خود صدر ناصر کے ایک رفیق عبداللطیف بغدادی، اور کمال الدین حسین جو انکے دستِ راست شمار ہوتے تھے، اس جنگ سے بیزاری کا اظہار کر چکے ہیں، اور اسی پاداش میں عتاب کے شکار ہو چکے ہیں۔

مسئلہ فلسطین کے ساتھ مصر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ مسئلہ اب تک جن مراحل سے گزرا ہے اُن کے پیش نظر یہ مسئلہ ہر امکانی حل سے دُور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور اب عرب عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مصری حکومت اس مسئلہ کے صحیح حل کے لیے کوئی مخلصانہ کوشش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی جبکہ اسرائیل کا نفوذ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اولاً مصری حکومت اُن ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کیے ہوئے ہے جو نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اسرائیل کے قدم مضبوط کر رہے ہیں۔ دوسری طرف جو ملک اسرائیل کو کچلنے کے لیے مدد دے سکتے تھے اُن سب سے مصری حکام نے سرد مہری کا نہ یہ اختیار کر رکھا ہے بلکہ کھلی کھلی مخاصمت تک نوبت پہنچا دی ہے۔ مسئلہ فلسطین کے بارے میں مصری سیاست کی نمایاں غلطیاں یہ ہیں کہ اُس نے غزہ پر بین الاقوامی ایمرجنسی فورس کا تسلط تسلیم کر کے اس علاقے کو عملاً اسرائیل کی ترکتاز کے لیے کھول دیا ہے۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں سے عرب رضاکار اسرائیل میں گھس کر گوریلا وار جاری رکھ سکتے تھے۔ اب بین الاقوامی پولیس عرب رضاکاروں کو اس علاقے میں داخل نہیں ہونے دیتی

اور اسرائیل اطمینان کے ساتھ اس علاقہ میں اپنے اقتصادی منصوبے رُوبکار لا رہا ہے۔ اسی طرح خلیج عقبہ پر بھی بین الاقوامی کنٹرول کو حکومتِ مصر نے تسلیم کر کے یہ خلیج عملاً یہودیوں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ بین الاقوامی کنٹرول سے پہلے یہودیوں کو اس خلیج میں گھسنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اب اُس نے ایلات کے مقام پر عظیم الشان بندرگاہ تعمیر کر لی ہے اور اُس کے جہاز بُرے طنطنے کے ساتھ افریقی ممالک میں آجا رہے ہیں۔ اس خلیج کے کھُل جانے سے وہ ناکہ بندی ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اسرائیل سخت پریشانی میں مبتلا تھا اور اس کی اقتصادی حالت شدید بُحران کا شکار ہو رہی تھی۔ اب وہ بے کھٹکے افریقی ممالک میں اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر رہا ہے اور افریقی ممالک کی کثیر تعداد بھی اس کے دام فریب میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔

یہ تمام تغیّرات مصری حکومت کی آنکھوں کے سامنے اس کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے وجود میں آرہے ہیں جنہیں دیکھ کر عرب عوام کے سینوں میں آگ کے تنور بھڑک رہے ہیں۔ مگر مصری حکومت ان کی تلافی کے لیے کوئی ٹھوس اقدام کرنے کے بجائے اب یہ اعلان کر رہی ہے کہ "فلسطین کے مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ عرب ممالک کی سوشلسٹ اور انقلاب پسند حکومتیں متحد ہو جائیں"۔ یعنی دنیا کے مسلمان اس پر متحد نہ ہوں، تمام عرب بھی اس پر متحد نہ ہوں، صرف وہ عرب ملک متحد ہوں جنہوں نے سوشلزم اختیار کیا ہے! فلسطین کی تنظیم آزادی کے ایک اجلاس میں صدر ناصر نے تقریر کرتے ہوئے کہا ہے:

> "میں صراحت سے کہوں گا کہ ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم اپنا دفاع بھی کر سکیں کجا کہ ہم حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ دریائے اُردن کا رُخ موڑنے کے مسئلے کو بھی سردست ملتوی کر دینا چاہیے"۔

عبدالحکیم عامر نے دورۂ فرانس کے دوران پیرس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> "جمہوریہ عرب اسرائیل سے جنگ کی نہ خواہش رکھتی ہے اور نہ ارادہ"۔

اسی دورے میں مصری حکومت نے ہزاروں ڈالر فرانس سے قرض لیا۔ مصر کے ایک فوجی افسر

بریگیڈیر محمد فوزی نے اپنی کتاب "صہیونیت اور اسرائیل" میں ص ۱۳۱ پر لکھا ہے کہ:

"بعض لوگ مسئلہ فلسطین کا حل جنگ قرار دیتے ہیں۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔
یہ حل اقوام متحدہ کی ان قراردادوں کے منافی ہے جن پر تمام عرب ممالک دستخط کر چکے ہیں۔
نیز یہ حل پر امن بقائے باہم کے اصول کے بھی خلاف ہے جس کا مصر علمبردار رہا ہے۔"

یہ کتاب قاہرہ میں ملٹری ٹریننگ کالج کے کورس میں شامل ہے۔ کیا یہ بھی کوئی معمہ ہے جسے مصر کے مسلم عوام نہیں سمجھ سکتے کہ مصری حکومت یمن میں ایک ارب پونڈ خرچ کر سکتی ہے، ٦٠ ہزار فوج استعمال کر سکتی ہے، مگر مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے لیے اس کے پاس ذرائع نہیں ہیں۔

دنیائے عرب بلکہ دنیائے اسلام میں اس وقت جو موضوع زبان زدِ عام و خاص ہے وہ ہے "اسلامی اتحاد"۔ عرب سربراہوں کی کانفرنس اپنے گزشتہ اجلاس میں یہ قرارداد پاس کر چکی ہے کہ مسئلہ فلسطین کو صرف عربوں تک محدود رکھنے کے بجائے اسے تمام مسلمانوں کا مسئلہ قرار دینا چاہیے، اور اس کے لیے مسلمان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ صومالی لینڈ کے سربراہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ملکوں کے درمیان بعض مسائل پر اتحاد ہونا چاہیے، اور اس غرض کے لیے مسلمان سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہونی چاہیے۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل اس تجویز کی تائید کرتے ہیں اور عملاً اس دعوت کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اب تقاضائے عقل و انصاف یہ تھا کہ مصری حکومت بڑھ کر اس دعوت سے تعاون کرتی، بلکہ اس کے مقدمۃ الجیش میں شامل ہوتی۔ مگر اس کے برعکس اس دعوت کی سب سے پہلے جس نے مخالفت کی ہے وہ مصر کے حکمراں ہیں۔ نہ وہ خود اس اسکیم میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں اور نہ دوسرے زیرِ اثر ممالک کو اس اسکیم میں شامل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ بلکہ اس اسکیم کا جواب وہ دلیل سے دینے کے بجائے سبّ و شتم پر اتر آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر عرب ممالک کی سوشلسٹ اور انقلاب پسند حکومتیں متحد ہو سکتی ہیں، اور انقلاب اور سوشلزم کے نظریات کو بنائے اتحاد قرار دے سکتی ہیں تو اسلام کی اصولی بنیاد پر اتحاد کیوں حرام ہے؟ علاوہ ازیں مصری حکام نے اپنے مخالفوں پر تنقید کے لیے دا اگر عرب سربراہوں کو مخالفوں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے، جو

زبان اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہ اسلامی اخلاق کے مطابق ہے نہ عربی اخلاق کے مطابق، بلکہ انسانی اخلاق بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ کہنا کہ "فلاں" سید خاندان میں سے نہیں بلکہ شیطان کے خاندان میں سے ہے"، "فلاں یہودی کا بچہ ہے"، "فلاں ڈاڑھا ہے"۔ کیا یہ زبان کسی مہذب حکومت کے پروپگنڈا کی زبان ہو سکتی ہے؟ آخر مصر کے باشندے اتنے گئے گزرے تو نہیں ہیں کہ وہ اپنے ملک کی ترجمانی اس انداز میں ہوتے دیکھ کر پریشان نہ ہوں۔

مصر کی اندرونی حالت بھی قابلِ مطالعہ ہے جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا ہے، مصری عوام کی اکثریت سیدھے سادے فلاحین پر مشتمل ہے۔ فلاحین کی اسلام سے وابستگی اس قدر اٹل ہے جس قدر کسی بڑھیا کا ایمان اٹل ہو سکتا ہے۔ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی طرح ان کی خواہش بھی یہ ہے کہ مصر کے اندر اسلام کا چرچا ہو، اسلامی تعلیمات کو فروغ حاصل ہو، اسلامی قانون کو فوقیت حاصل ہو، ان کے سربراہ اسلامی شریعت کے پابند اور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہوں۔ مگر حالات ان کی خواہشوں کی نہ صرف تکمیل نہیں کرتے بلکہ انہیں پامال کرتے ہیں۔

مصر کا میثاق جسے دستوری اختیارات حاصل ہیں، صاف اعلان کرتا ہے کہ ملک کے اندر سوشلسٹ نظام نافذ کیا جائے گا۔ صدر ناصر اس سوشلسٹ نظام کو "نظریاتی سوشلزم" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اور مصر کا پریس "نظریاتی سوشلزم" کی تشریح "مارکسزم" کرتا ہے۔ فاروق کے عہد تک دستور میں کم از کم یہ فقرہ موجود تھا کہ "ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا"۔ مگر مصری میثاق اس "رجعت پسندی" سے بالکل پاک ہے۔ سوشلسٹ نظام صرف زبان سے نہیں بلکہ عملاً مصر میں نافذ کیا جاتا ہے۔ "عرب سوشلسٹ پارٹی" جو مصر کی واحد پارٹی ہے، اس کا نفاذ اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ مصر کی "کمیونسٹ پارٹی" اپنے وجود کو ختم کر کے "عرب سوشلسٹ پارٹی" میں ادغام کا اعلان کرتی ہے۔ سوشلزم کے نفاذ کے بعد مصری حکومت نے اندھا دھند شخصی جائدادوں اور کمپنیوں پر جس طرح قبضہ کیا ہے اس نے عوام کے اندر خوف و ہراس اور انتقامی جذبات کو بھڑکا دیا ہے۔ مصر کی اقتصادی حالت تباہی کے گڑھے تک پہنچ چکی ہے۔ خود الاہرام کے بیان کے مطابق قاہرہ گداگروں کا شہر

بن چکا ہے۔ اس سوشلزم سے اگر حقیقتاً کسی کو فائدہ پہنچا ہے تو وہ مزدور اور کسان نہیں ہیں بلکہ عرب سوشلسٹ پارٹی کے عہدیدار ہیں، جن کی دھاندلیوں اور لوٹ کھسوٹ سے کوئی شریف انسان نہیں بچ سکا۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مصر کے بڑے بڑے شہر، قاہرہ اور اسکندریہ فسق و فجور کے اڈوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اخبارات پر کمیونسٹ اور ملاحدہ چھائے ہوئے ہیں اور وہ جی بھر کر اباحیت اور اخلاقی انارکی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ہر وہ شخص جو پابندی سے نماز پڑھتا ہے، قہوہ خانوں اور تھیٹروں اور سینماؤں سے پرہیز کرتا ہے، وہ ان کی نگاہ میں رجعت پسند ہے، استعمار کا ایجنٹ ہے، گردن زدنی ہے۔

سب سے بڑی آفت جو مصر پر ٹوٹ رہی ہے، وہ فرعونی تہذیب کا احیاء ہے۔ مصری میثاق یہ کہتا ہے کہ "ہم اپنی ترقی کا خاکہ عہدِ فراعنہ کی تہذیب سے اخذ کریں گے"۔ رعمسیس (فرعون مصر) کا مجسمہ صحراء کی کھدائیوں سے منتقل کر کے قاہرہ کے وسط میں نصب کیا گیا اور اس منصوبے پر ۵ لاکھ پونڈ صرف ہوئے۔ صدر ناصر نے اپنی ایک تقریر میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "اے تحتموث اور رعمسیس کے فرزندو!" اسی طرح ایک اور موقع پر تقریر کے دوران کہا تھا: "دو ہزار سال کے بعد آج مصر پر پہلی مرتبہ خود اہلِ مصر کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے"۔ گویا حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لیکر اب تک کے تمام غیر مصری مسلمان حکمرانوں کا دور اُن کی نگاہ میں استعماری دور تھا۔ اور فراعنہ کے دور کے بعد اب مصر کو پہلی مرتبہ استعمار سے آزادی نصیب ہوئی ہے۔ اور یہ جسارت یہاں تک بڑھتی ہے کہ ابوسمبل کے مندروں اور مجسموں کی بنیادوں میں مصری میثاق، انجیل اور قرآن مجید کے دو دو نسخے دفن کیے جاتے ہیں۔ کیا کسی اَن پڑھ سے اَن پڑھ مسلمان سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ فراعنہ کے بتوں کے نیچے قرآن مجید رکھے جانے پر خاموش رہے گا اور اس کی غیرتِ ایمانی اسے گوارا کرے گی؟

یہ سب کچھ ان حالات میں ہو رہا ہے جبکہ شہری آزادیاں مفقود ہیں۔ پریس حکومت کے

قبضے میں ہے۔ آزاد اخبارات ختم ہو چکے ہیں۔ مصر کے نامور اخبار "المصری" کا ایڈیٹر ابو الفتح جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک دوسرے مشہور اخبار کا ایڈیٹر مصطفیٰ امین جو مصری حکام کے ثنا خوانوں میں پیش پیش تھا، جیل میں نظر بند ہے اور اس پر امریکہ کی جاسوسی کا الزام ہے۔ کمیونسٹ اخبارات و رسائل ملک میں بارش کی طرح برس رہے ہیں۔ کمیونسٹ لٹریچر بازاروں میں پانی کی طرح بہ رہا ہے۔ الاہرام کے ایڈیٹر محمد حسین ہیکل اور صوت القاہرہ کے اناؤنسر سعید احمد برابر سوشلزم کی تفسیریں عوام کو سنا رہے ہیں۔ ایک گروہ ازہر کے علماء کا بھی ہاتھ لگ گیا ہے جو اسلام کو سوشلزم اور اسلامی تاریخ کی نمایاں شخصیتوں کو سوشلسٹ ثابت کر رہا ہے۔ سوشلزم کے فضائل و مناقب کی گونج سے مصر کی فضا مرتعش ہو رہی ہے اور آسمان پھٹ رہا ہے۔ مصری اخبارات کے بیان کے مطابق ہر روز صدر ناصر کو قتل کرنے کی سازش پکڑی جاتی ہے جس کے پیچھے کسی نہ کسی "رجعت پسند" گروہ کا ہاتھ تار ہلاتا دریافت ہو جاتا ہے۔ اور عملاً یہ حال ہے کہ جب سے مصر میں مختلف کارخانوں اور اداروں کو قومی تحویل میں لیا گیا ہے بلکہ صحیح الفاظ میں سوشلسٹ پارٹی کی تحویل میں دیا گیا ہے، ان اداروں سے ہونے والی آمدنی صفر کے برابر ہو چکی ہے اور مصارف پہلے سے دوگنے ہو گئے ہیں۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے۔ اب اس تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ ہو۔ "عرب سوشلسٹ پارٹی" اور مصری حکام عوام کے حلق میں جو تلخ گھونٹ اتارنا چاہتے ہیں وہ اُن سے اُتر نہیں رہے ہیں۔ میثاق کے محامد و محاسن مصری عوام سے منوانے کے لیے لاکھوں پونڈ صرف ہو رہے ہیں، مگر عوام میثاق پر ایمان لانے سے اِبا کر رہے ہیں۔ وہ اسے کسی ایچ پیچ کے بغیر کمیونسٹ دستور کا چربہ سمجھتے ہیں۔ فرعونی تہذیب کے احیاء کے لیے پوری حکومت کی مشینری وقفِ تگ و تاز ہے۔ مصری پونڈ پر فرعون کی تصویر چھپ گئی ہے، ڈاک کی ٹکٹوں پر فرعون کی تصویر ہے، مصری کرنسی پر فرعونی عہد کا نشان "عقاب" ثبت ہو گیا ہے، سڑکوں کے نام شارع رعمیس، پارکوں کے نام میدان رعمیس، سینماؤں کا نام رعمیس سینما، مصر کی ساختہ موٹر (اگرچہ یہ بات مشکوک ہے) کا نام رعمیس رکھ دیا گیا ہے۔ مگر مصر کے مسلم عوام اس تہذیب پر ہزار بار لعنت بھیج چکے ہیں اور وہ فرعون کو اُسی

نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے حضرت موسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو دیکھنا چاہیے اسی طرح یمن میں حکومت کی مسلسل غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ یمن میں مرنے والے فوجیوں کو شہید حریت کا خطاب دیا گیا ہے۔ اُن کے رشتہ داروں کو مختلف بہانوں سے راضی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود مصری فوج کا ایک حصہ اور مصری عوام اس برادرکشی سے قطعی بیزار ہیں۔

اس کے مقابلے میں اسلام پسند عنصر، خواہ وہ اخوان المسلمون کا حامی ہو یا مخالف، جو بات کہتا ہے اس کی صدائے بازگشت عوام میں افق تا افق سُنی جاتی ہے۔ اخوان المسلمون کے رہنما اور کارکن ۱۹۵۴ء کے اواخر سے جیلوں میں ہیں۔ سیاسی لحاظ سے اُن کی کسی سرگرمی کا تصور ہی محال ہے۔ البتہ اُن کے اہل علم خواہ وہ جیل میں تھے یا باہر، علمی اور فکری لحاظ سے ملک کے اندر اسلام کو بچانے کی جو خدمت کر سکتے تھے انہوں نے کی ہے۔ اسلام کے مختلف موضوعات پر انہوں نے لٹریچر تیار کیا۔ مصر میں تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور اسلامی نظام فکر پر اس قدر وافر لٹریچر پچھلے دس سالوں میں تیار ہوا ہے اور اس قدر مختلف النوع مسائل پر مشتمل ہے کہ انسان لکھنے والوں کی جرأت و ہمت اور چھاپنے والوں کے ایثار کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج ہمیں اسلام کے فوجداری نظام پر عبدالقادر عودہ شہیدؒ کی مشہور کتاب کے دو حصوں کے علاوہ نامور مصری محقق فتحی بہنسی کی اس موضوع پر چھ ضخیم کتابیں ملتی ہیں۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر طنطا کے کورٹ آف اپیل کے جج کی بے نظیر تالیف ملتی ہے۔ اسلامی نظام کے فلسفیانہ مباحث پر محمد قطب، عبداللہ السمان، محمد حسین کی تصانیف ملتی ہیں۔ "نامورانِ اسلام" کے عنوان سے اسلامی تاریخ کے فقہاء، مفسرین، محدثین، قائدین، اہل لغت و نحو اور ارباب سیر و تاریخ کی زندگیوں پر مشتمل طویل سلسلہ ہمارے سامنے موجود ہے جو مصر کے مطبوعات نے چھاپا ہے۔ الغرض اس طرح ہزارہا کتابیں اس دور میں اہل علم نے تیار کی ہیں اور فکری اور علمی لحاظ سے اسلام کی برتری ثابت کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ یہی "رجعت پسندانہ" لٹریچر مصر کے

عوام میں قبولیت کا مقام حاصل کر سکا ہے۔ مصر کے مکتبے اسی لٹریچر سے لبریز، اور خریداروں کی اکثریت کی بغل میں یہی لٹریچر دیکھا گیا ہے۔

مصر کی کمیونسٹ پارٹی (جو اب عرب سوشلسٹ پارٹی کے نام سے موسوم ہے) کے لیے یہ صورتِ حال سوہانِ رُوح بنی ہوئی تھی۔ مصر کو سوشلسٹ (یا صحیح لفظوں میں کمیونسٹ) معاشرے میں تبدیل کرنے کے لیے ان "رجعت پسندانہ" افکار اور "رجعت پسند" اہلِ قلم کا کلی استیصال ضروری تھا۔ ہمارے علم کے مطابق کمیونسٹ لیڈروں نے ایک طویل رپورٹ تیار کر کے ماسکو بھیجی جس میں یہ وضاحت کی گئی کہ مصر میں جب تک رجعت پسند گروہ کا ایک فرد بھی موجود ہے اُس وقت تک مصر ہمارے لیے لقمۂ تر نہیں بن سکتا۔

سیاسی لحاظ سے بھی مصر کی جو کیفیت ہے اُس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مصری حکام کے تصرفِ ناروا سے شام کے لوگ صرف ۴ سال کے اندر چلّا اُٹھے اور انہوں نے شام کو مصر کے پنجے سے آزاد کروا کر دم لیا لیکن جہاں ۱۲ سال سے یہ ناروا کارروائیاں جاری ہوں وہاں آخر اضطراب و بیزاری کس درجہ تک پہنچ چکی ہو گی۔ مصری عوام کی مصری حکام سے بیزاری کا کھلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب ۱۹۶۴ء میں مصطفیٰ نحاس پاشا کی وفات ہوئی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ان کے جنازہ میں شریک ہوئے اور جنازہ کے اندر عوام اور پولیس کی جھڑپیں ہوئیں۔ اس بیزاری کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ایک قانون نافذ کیا گیا جس کی رُو سے صدرِ مملکت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی شخص کو سیاسی وجوہ کی بنا پر مقدمہ چلائے بغیر گرفتار کر سکتا ہے اور اس کے خلاف کسی جگہ اپیل نہیں کی جا سکتی۔

ادھر یمن کا مسئلہ بھی ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے کہ مصر کے عوام جوشِ جنوں میں سر بھی پھوڑ لیں تو کم ہے۔ تین سال تک مصری فوجوں نے یمن کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ ایک ارب پونڈ خرچ کیے۔ دس ہزار (اور دوسری روایت کے مطابق ۲۵ ہزار) مصری سپوتوں کو اس جنگ کی نذر کیا۔ مصر کی اقتصادیات کا ستیاناس کیا۔ اسرائیل کے مقابلے کے لیے جو رہی سہی قوت موجود

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تفہیم القرآن

الذاریات

نام پہلے ہی لفظ وَالذّٰرِیٰت سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورۃ جس کی ابتدا لفظ الذاریات سے ہوتی ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور انداز بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ تکذیب و استہزاء اور جھوٹے الزامات سے تو بڑے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا، مگر ابھی ظلم و تشدد کی چکی چلنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ بھی اُسی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے جس میں سورۂ ق نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مباحث اس کا بڑا حصہ آخرت کے موضوع پر ہے، اور آخر میں توحید کی دعوت پیش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بات نہ ماننا اور اپنے جاہلانہ تصورات پر اصرار کرنا خود انہی قوموں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے جنہوں نے یہ روش اختیار کی ہے۔

آخرت کے متعلق جو بات اس سورہ کے چھوٹے چھوٹے مگر نہایت پُرمعنی فقروں میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے مآل و انجام کے بارے میں لوگوں کے مختلف اور متضاد عقیدے خود اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہر ایک نے قیاسات دوڑا کر اپنی جگہ جو نظریہ قائم کر لیا اسی کو وہ اپنا عقیدہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کسی نے سمجھا کہ زندگی بعد موت نہیں ہوگی۔ کسی نے اس کو

مانا تو تناسخ کی شکل میں مانا۔ کسی نے حیاتِ اُخروی اور جزا و سزا کو تسلیم کیا تو جزائے اعمال سے بچنے کے لیے طرح طرح کے سہارے تجویز کر لیے۔ اتنے بڑے اور اہم ترین بنیادی مسئلے پر، جس کے بارے میں آدمی کی رائے کا غلط ہو جانا اُس کی پوری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے مستقبل کو برباد کر ڈالتا ہے، علم کے بغیر محض قیاسات کی بنا پر کوئی عقیدہ بنا لینا ایک تباہ کُن حماقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہ کر ساری عمر جاہلانہ غفلت میں گزار دے اور مرنے کے بعد اچانک ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جس کے لیے اس نے قطعاً کوئی تیاری نہ کی تھی۔ ایسے مسئلے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو آخرت کے متعلق جو علم خدا کی طرف سے اُس کا نبی دے رہا ہے اُس پر وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرے اور زمین و آسمان کے نظام اور خود اپنے وجود پر نگاہ ڈال کر کھلی آنکھوں سے دیکھے کہ کیا اُس علم کے صحیح ہونے کی شہادت ہر طرف موجود نہیں ہے؟ اس سلسلے میں ہوا اور بارش کے انتظام کو، زمین کی ساخت اور اس کی مخلوقات کو، انسان کے اپنے نفس کو، آسمان کی تخلیق کو، اور دنیا کی تمام اشیاء کے جوڑوں کی شکل میں بنائے جانے کو آخرت کی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور انسانی تاریخ سے مثالیں دے کر بتایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کس طرح ایک قانونِ مکافات کا مقتضی نظر آ رہا ہے۔

اس کے بعد بڑے مختصر انداز میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے خالق نے تم کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ تمہارے بناوٹی معبودوں کی طرح نہیں ہے جو تم سے رزق لیتے ہیں اور تمہاری مدد کے بغیر جن کی خدائی نہیں چل سکتی۔ وہ ایسا معبود ہے جو سب کا رزاق ہے، کسی سے رزق لینے کا محتاج نہیں، اور جس کی خدائی خود اُس کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ جب بھی کیا گیا ہے کسی معقول بنیاد پر نہیں بلکہ اسی ضد اور ہٹ دھرمی اور جاہلانہ غرور کی بنیاد پر کیا گیا ہے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی جا رہی ہے، اور اس کی محرک بجز سرکشی کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔

پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ان سرکشوں کی طرف التفات نہ کریں اور اپنی دعوت و تذکیر کا کام کیے جائیں، کیونکہ وہ ان لوگوں کے لیے چاہے نافع نہ ہو مگر ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔ رہے وہ ظالم جو اپنی سرکشی پر مصر ہیں، تو ان سے پہلے اسی روش پر چلنے والے اپنے حصے کا عذاب پا چکے ہیں اور ان کے حصے کا عذاب تیار ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں، پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں[1]، پھر سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں، پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں[2]،

---

[1] اس امر پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ الذّاریات سے مراد پراگندہ کرنے والی اور گرد و غبار اٹھانے والی ہوائیں ہیں، اور الحامِلاتِ وِقْراً (بھاری بوجھ اٹھانے والیوں) سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو سمندروں سے لاکھوں کروڑوں گیلن پانی کے بخارات بادلوں کی شکل میں اٹھا لیتی ہیں۔ یہی تفسیر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر اور مجاہد، سعید بن جُبیر، حسن بصری، قَتادہ اور سُدّی وغیرہ حضرات سے منقول ہے۔

[2] الجارِیاتِ یُسْراً اور المُقَسِّماتِ اَمْراً کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے، یا یہ مفہوم لینا جائز رکھا ہے کہ ان دونوں سے مراد بھی ہوائیں ہی ہیں، یعنی یہی ہوائیں پھر بادلوں کو لے کر چلتی ہیں اور پھر روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، جہاں جتنا حکم ہوتا ہے، پانی تقسیم کرتی ہیں۔ دوسرے گروہ نے الجاریاتِ یُسراً سے مراد سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی کشتیاں لی ہیں اور المُقسّماتِ امراً سے مراد وہ فرشتے لیے ہیں جو

حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جا رہا ہے[۱] وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے[۲]۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اُس کی مخلوقات کے نصیب کی چیزیں اُن میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک روایت کی رُو سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں فقروں کا یہ مطلب بیان کرکے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا تو میں اسے بیان نہ کرتا۔ اسی بنا پر علامہ آلوسی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کے سوا اِن فقروں کا کوئی اور مطلب لینا جائز نہیں ہے اور جن لوگوں نے کوئی دوسرا مفہوم لیا ہے انھوں نے بے جا جسارت کی ہے لیکن حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند ضعیف ہے اور اِس کی بنیاد پر قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع حضور ہی نے اِن فقروں کی یہ تفسیر فرمائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحابہ و تابعین کی ایک معتد بہ جماعت سے یہی دوسری تفسیر منقول ہے لیکن مفسرین کی ایک اچھی خاصی جماعت نے پہلی تفسیر بھی بیان کی ہے اور سلسلۂ کلام سے وہ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب نے بھی اپنے ترجموں میں پہلا مفہوم ہی لیا ہے

[۳] اصل میں لفظ تُوْعَدُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اگر وَعْد سے ہو تو اس کا مطلب ہوگا "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"، اور وَعِید سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ "جس چیز کا تم کو ڈراوا دیا جا رہا ہے"۔ زبان کے لحاظ سے دونوں مطلب یکساں درست ہیں لیکن موقع و محل کے ساتھ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک اور فسق و فجور میں غرق تھے اور یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کبھی ان کو محاسبے اور جزائے اعمال سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اسی لیے ہم نے تُوْعَدُوْنَ کو وعدے کے بجائے وعید کے معنی میں لیا ہے۔

[۴] یہ ہے وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے۔ اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ جس بے نظیر نظم اور باقاعدگی کے ساتھ بارش کا یہ عظیم الشان ضابطہ تمہاری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، اور جو حکمت اور مصلحتیں اس میں صریح طور پر کارفرما نظر آتی ہیں، وہ اس بات پر گواہی دے رہی ہیں کہ یہ دنیا کوئی بے مقصد اور بے معنی گھروندا نہیں ہے جس میں لاکھوں کروڑوں برس سے ایک بہت بڑا کھیل بس یونہی الل ٹپ ہوئے جا رہا ہو، بلکہ یہ درحقیقت ایک کمال درجے کا حکیمانہ نظام ہے جس میں ہر کام کسی مقصد

اور کسی مصلحت کے لیے ہو رہا ہے۔ اس نظام میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہاں انسان جیسی ایک مخلوق کو عقل، شعور، تمیز اور تصرف کے اختیارات دے کر، اس میں نیکی و بدی کی اخلاقی حس پیدا کر کے اور اسے ہر طرح کے اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط کاموں کے مواقع دے کر، زمین میں گُل کھلانے کے لیے محض فضول اور لایعنی طریقے سے چھوڑ دیا جائے، اور اس سے کبھی یہ باز پُرس نہ ہو کہ دل و دماغ اور جسم کی جو قوتیں اس کو دی گئی تھیں، دنیا میں کام کرنے کے لیے جو وسیع ذرائع اس کے حوالے کیے گئے تھے، اور خدا کی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات اُسے دیئے گئے تھے، اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ جس نظامِ کائنات میں سب کچھ بامقصد ہے، اس میں صرف انسان جیسی عظیم مخلوق کی تخلیق کیسے بے مقصد ہو سکتی ہے۔ جس نظام میں ہر چیز مبنی بر حکمت ہے اس میں تنہا ایک انسان ہی کی تخلیق کیسے فضول اور عبث ہو سکتی ہے۔ مخلوقات کی جو اقسام عقل و شعور نہیں رکھتیں ان کی تخلیق کی مصلحت تو اسی عالمِ طبیعی میں پوری ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی مدتِ عمر ختم ہونے کے بعد ضائع کر دی جائیں تو یہ عین معقول بات ہے، کیونکہ انہیں کوئی اختیارات دیئے ہی نہیں گئے ہیں کہ ان سے محاسبے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ مگر عقل و شعور اور اختیارات رکھنے والی مخلوق، جس کے افعال محض عالمِ طبیعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ اخلاقی نوعیت بھی رکھتے ہیں، اور جس کے اخلاقی نتائج پیدا کرنے والے اعمال کا سلسلہ محض زندگی کی آخری ساعت تک ہی نہیں چلتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اُس پر اخلاقی نتائج مترتب ہوتے رہتے ہیں، اسے صرف اُس کا طبیعی کام ختم ہو جانے کے بعد نباتات و حیوانات کی طرح کیسے ضائع کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے تو اپنے اختیار و ارادہ سے جو نیکی یا بدی کی ہے اس کی ٹھیک ٹھیک مبنی برحق و انصاف جزا اس کو لازماً ملنی ہی چاہیے، کیونکہ یہ اُس مصلحت کا بنیادی تقاضا ہے جس کے تحت دوسری مخلوقات کے برعکس اس کو ایک ذی اختیار مخلوق بنایا گیا ہے۔ اُس سے محاسبہ نہ ہو، اس کے اخلاقی اعمال پر جزا و سزا نہ ہو، اور اس کو بھی بے اختیار مخلوقات کی طرح عمرِ طبیعی ختم ہونے پر ضائع کر دیا جائے، تو لامحالہ اس کی تخلیق سراسر عبث ہو گی، اور ایک حکیم سے فعلِ عبث کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی[5]، آخرت کے بارے میں تمہاری بات ایک دوسرے

اِس کے علاوہ آخرت اور جزا و سزا کے وقوع پر اِن چار مظاہرِ کائنات کی قسم کھانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ منکرینِ آخرت زندگی بعدِ موت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم جب مرکر خاک میں رل مل جائیں گے اور ہمارا ذرہ ذرہ جب زمین میں منتشر ہو جائے گا تو کیسے ممکن ہے کہ یہ سارے منتشر اجزائے جسم پھر اکٹھے ہو جائیں اور ہمیں دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے۔ اس شبہ کی غلطی اُن چاروں مظاہرِ کائنات پر غور کرنے سے خود بخود رفع ہو جاتی ہے جنہیں آخرت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورج کی شعاعیں روئے زمین کے اُن تمام ذخائرِ آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے۔ اس عمل سے پانی کے بے حد و حساب قطرے اڑ جاتے ہیں اور اپنے مخزن میں باقی نہیں رہتے۔ مگر وہ فنا نہیں ہو جاتے بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہوا میں محفوظ رہتا ہے۔ پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہوا اُن قطروں کی بھاپ کو سمیٹ لاتی ہے، اس کو کثیف بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے، ان بادلوں کو لے کر روئے زمین کے مختلف حصّوں میں پھیل جاتی ہے، اور خدا کی طرف سے جو وقت مقرر ہے ٹھیک اُسی وقت ایک ایک قطرے کو اُسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا، زمین پر واپس پہنچا دیتی ہے۔ یہ منظر جو آئے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے، اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر جمع ہو سکتے ہیں اور ان انسانوں کو اسی شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جا سکتا ہے جس میں وہ پہلے موجود تھے۔ یہ اجزا خواہ مٹی میں ہوں، یا پانی میں، یا ہوا میں، بہر حال رہتے اِسی زمین اور اس کے ماحول ہی میں ہیں۔ جو خدا پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہو جانے کے بعد پھر اُسی ہوا کے ذریعہ سے سمیٹ لاتا ہے اور انہیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے، اس کے لیے انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اجزاء کو ہوا، پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو؟

[5] اصل میں لفظ ذات الحُبُك استعمال ہوا ہے۔ حُبُک راستوں کو بھی کہتے ہیں۔ اُن لہروں کو

مختلف ہے[۶]۔ اُس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے[۷]۔

بھی کہتے ہیں جو ہوا کے چلنے سے ریگستان کی ریت اور ٹھیرے ہوئے پانی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور گھونگھر والے بالوں میں جو لٹیں سی بن جاتی ہیں اُن کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہاں آسمان کو حُبُک والا یا تو اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ آسمان پر اکثر طرح طرح کی شکلوں والے بادل چھائے رہتے ہیں جن میں ہوا کے اثر سے بار بار تغیر ہوتا ہے اور کبھی کوئی شکل نہ خود قائم رہتی ہے، نہ کسی دوسری شکل سے مشابہ ہوتی ہے۔ یا اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ رات کے وقت آسمان پر جب تارے بکھرے ہوتے ہیں تو آدمی دیکھتا ہے کہ ان کی بہت سی مختلف شکلیں ہیں اور کوئی شکل دوسری شکل سے نہیں ملتی۔

۶۔ اِس اختلافِ اقوال پر متفرق شکلوں والے آسمان کی قسم تشبیہ کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یعنی جس طرح آسمان کے بادلوں اور تاروں کے جُھرمٹوں کی شکلیں مختلف ہیں اور ان میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی، اسی طرح آخرت کے متعلق تم لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہو اور ہر ایک کی بات دوسرے سے مختلف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا ازلی و ابدی ہے اور کوئی قیامت برپا نہیں ہو سکتی۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ نظامِ حادث ہے اور ایک وقت میں یہ جا کر ختم بھی ہو سکتا ہے، مگر انسان سمیت جو چیز بھی فنا ہو گئی پھر اس کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی اعادے کو ممکن مانتا ہے، مگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے اچھے اور بُرے نتائج بھگتنے کے لیے بار بار اسی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ کوئی جنت اور جہنم کا بھی قائل ہے، مگر اس کے ساتھ تناسخ کو بھی ملاتا ہے، یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ گناہ گار جہنم میں بھی جا کر سزا بھگتتا ہے اور پھر اس دنیا میں بھی سزا پانے کے لیے جنم لیتا رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی خود ایک عذاب ہے، جب تک انسان کے نفس کو مادی زندگی سے لگاؤ باقی رہتا ہے اُس وقت تک وہ اِس دنیا میں مر مر کر پھر جنم لیتا رہتا ہے، اور اس کی حقیقی نجات (نروان) یہ ہے کہ وہ بالکل فنا ہو جائے۔ کوئی آخرت اور جنت و جہنم کا قائل ہے، مگر کہتا ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر موت دے کر انسان کے ازلی گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے، اور اُس بیٹے پر ایمان لا کر آدمی اپنے اعمالِ بد کے بُرے نتائج سے بچ جائے گا۔ کچھ دوسرے لوگ آخرت اور جزا و سزا، ہر چیز کو مان کر بعض ایسے بزرگوں کو شفیع تجویز کر لیتے ہیں جو اللہ کے ایسے

مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے[ؕ]، جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش

ہیں

پیارے ہیں، یا اللہ کے ہاں ایسا زور رکھتے ہیں کہ جو اُن کا دامن گرفتہ ہو وہ دنیا میں سب کچھ کر کے بھی سزا سے بچ سکتا ہے۔ اور ان بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی اِس عقیدے کے ماننے والوں میں اتفاق نہیں ہے، بلکہ ہر ایک گروہ نے اپنے الگ الگ شفیع بنا رکھے ہیں۔ یہ اختلافِ اقوال خود ہی اِس امر کا ثبوت ہے کہ وحی و رسالت سے بے نیاز ہو کر انسان نے اپنے اور اِس دنیا کے انجام پر جب بھی کوئی رائے قائم کی ہے، علم کے بغیر قائم کی ہے۔ ورنہ اگر انسان کے پاس اس معاملہ میں فی الواقع براہِ راست علم کا کوئی ذریعہ ہوتا تو اتنے مختلف اور متضاد عقیدے پیدا نہ ہوتے۔

ؕ اصل الفاظ ہیں يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ۔ اس فقرے میں عَنْهُ کی ضمیر کے دو مرجع ہو سکتے ہیں۔ ایک جزائے اعمال۔ دوسرے قولِ مختلف۔ پہلی صورت میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "جزائے اعمال کو تو ضرور پیش آنا ہے، تم لوگ اُس کے بارے میں طرح طرح کے مختلف عقیدے رکھتے ہو، مگر اُس کو ماننے سے وہی شخص برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے۔" دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ "اِن مختلف اقوال سے وہی شخص گمراہ ہوتا ہے جو دراصل حق سے برگشتہ ہے۔"

ؕ اِن الفاظ میں قرآن مجید ایک اہم حقیقت پر انسان کو متنبہ کر رہا ہے۔ قیاس و گمان کی بنا پر کوئی اندازہ کرنا یا تخمینہ لگانا، دنیوی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو کسی حد تک چل سکتا ہے، اگرچہ علم کا قائم مقام پھر بھی نہیں ہو سکتا، لیکن اِتنا بڑا بنیادی مسئلہ کہ ہم اپنی پوری زندگی کے اعمال کے لیے کسی کے سامنے ذمہ دار و جواب دہ ہیں یا نہیں، اور ہیں تو کس کے سامنے، کب اور کیا جوابدہی ہم کو کرنی ہوگی، اور اُس جوابدہی میں کامیابی و ناکامی کے نتائج کیا ہوں گے، یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق آدمی محض اپنے قیاس و گمان کے مطابق ایک اندازہ قائم کرلے اور پھر اسی جوئے کے داؤں پر اپنا تمام سرمایۂ حیات لگا دے۔ اس لیے کہ یہ اندازہ اگر غلط نکلے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آدمی نے اپنے آپ کو بالکل تباہ و برباد کر لیا۔ مزید براں یہ مسئلہ سرے سے اُن مسائل میں سے ہے ہی نہیں جن کے بارے میں آدمی محض قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہو۔ کیونکہ قیاس اُن امور

ہیں۸۔ پوچھتے ہیں آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا؟ وہ اُس روز آئے گا جب یہ لوگ آگ پر تپائے

میں چل سکتا ہے جو انسان کے دائرۂ محسوسات میں شامل ہوں، اور یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا کوئی پہلو بھی محسوسات کے دائرے میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی قیاسی اندازہ صحیح ہو سکے۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر آدمی کے لیے اِن ماورائے حس و ادراک مسائل کے بارے میں رائے قائم کرنے کی صحیح صورت کیا ہے، تو اس کا جواب قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ دیا گیا ہے، اور خود اِس سورہ سے بھی یہی جواب مترشح ہوتا ہے کہ انسان براہِ راست خود حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا، حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ سے دیتا ہے، اور اُس علم کی صحت کے متعلق آدمی اپنا اطمینان اس طریقہ سے کر سکتا ہے کہ زمین اور آسمان اور خود اس کے اپنے نفس میں جو بے شمار نشانیاں موجود ہیں اُن پر غائر نگاہ ڈال کر دیکھے اور پھر بے لاگ طریقہ پر سوچے کہ یہ نشانیاں آیا اُس حقیقت کی شہادت دے رہی ہیں جو نبی بیان کر رہا ہے، یا اُن مختلف نظریات کی تائید کرتی ہیں جو دوسرے لوگوں نے اس کے بارے میں پیش کیے ہیں؟ خدا اور آخرت کے متعلق علمی تحقیق کا یہی ایک طریقہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر جو بھی اپنے قیاسی اندازوں پر چلا وہ مارا گیا۔

۹۔ یعنی اُنہیں کچھ پتہ نہیں ہے کہ اپنے اِن غلط اندازوں کی وجہ سے وہ کس انجام کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ اِن اندازوں کی بنا پر جو راستہ بھی کسی نے اختیار کیا ہے وہ سیدھا تباہی کی طرف جاتا ہے۔ جو شخص آخرت کا منکر ہے وہ سرے سے کسی جوابدہی کی تیاری ہی نہیں کر رہا ہے اور اِس خیال میں مگن ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی، حالانکہ اچانک وہ وقت آ جائے گا جب اس کی توقعات کے بالکل خلاف دوسری زندگی میں اُس کی آنکھیں کھلیں گی اور اسے معلوم ہوگا کہ یہاں اس کو اپنے ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ جو شخص اِس خیال میں ساری عمر کھپا رہا ہے کہ مر کر پھر اسی دنیا میں واپس آؤں گا، اُسے مرتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ اب واپسی کے سارے دروازے بند ہیں، کسی نئے عمل سے پچھلی زندگی کے اعمال کی تلافی کا اب کوئی موقع نہیں، اور آگے ایک اور زندگی ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے اپنی دنیوی زندگی کے نتائج دیکھنے اور بھگتنے ہیں۔ جو شخص اس امید میں اپنے آپ کو ہلاک

جائیں گے۔[۱۱] (ان سے کہا جائے گا) اب چکھو مزا اپنے فتنے کا،[۱۲] یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی

لیے ڈالتا ہے کہ نفس اور اس کی خواہشات کو جب پوری طرح مار دو نگا تو فنائے محض کی شکل میں مجھے عذابِ ہستی سے نجات مل جائے گی، وہ موت کے دروازے سے گزرتے ہی دیکھ لے گا کہ آگے فنا نہیں بلکہ بقا ہے اور اسے اب اِس امر کی جوابدہی کرنی ہے کہ کیا تجھے وجود کی نعمت اسی لیے دی گئی تھی کہ تو اسے بنانے اور سنوارنے کے بجائے مٹانے میں اپنی ساری محنتیں صرف کر دیتا؟ اسی طرح جو شخص کسی ابن اللہ کے کفارہ بن جانے یا کسی بزرگ ہستی کے شفیع بن جانے پر بھروسہ کر کے عمر بھر خدا کی نافرمانیاں کرتا رہا اُسے خدا کے سامنے پہنچتے ہی پتہ چل جائے گا کہ یہاں نہ کوئی کسی کا کفارہ ادا کرنے والا ہے اور نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ اپنے زور سے یا اپنی محبوبیت کے صدقے میں کسی کو خدا کی پکڑ سے بچا لے۔ پس یہ تمام قیاسی عقیدے درحقیقت ایک افیون ہیں جس کی پینک میں یہ لوگ بے سُدھ پڑے ہوتے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں ہے کہ خدا اور انبیاء کے دیئے ہوئے صحیح علم کو نظر انداز کر کے اپنی جس جہالت پر یہ مگن ہیں وہ انہیں کدھر لیے جا رہی ہے۔

[۱۱] کفار کا یہ سوال کہ روزِ جزاء کب آئے گا؟ علم حاصل کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ طعن اور استہزاء کے طور پر تھا، اس لیے اُن کو جواب اِس انداز سے دیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کو بدکرداریوں سے باز آنے کی نصیحت کرتے ہوئے اس سے کہیں کہ ایک روز ان حرکات کا بُرا نتیجہ دیکھو گے، اور وہ اس پر ایک ٹھٹھا مار کر آپ سے پوچھے کہ حضرت، آخر وہ دن کب آئے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا یہ سوال اُس بُرے انجام کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے نہیں بلکہ آپ کی نصیحتوں کا مذاق اڑانے کے لیے ہوگا۔ اس لیے اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ وہ اُس روز آئے گا جب تمہاری شامت آئے گی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آخرت کے مسئلے پر اگر کوئی منکرِ آخرت سنجیدگی کے ساتھ بحث کر رہا ہو تو وہ اُس کے موافق و مخالف دلائل پر تو بات کر سکتا ہے مگر جب تک اس کا دماغ بالکل ہی خراب نہ ہو چکا ہو، یہ سوال وہ کبھی نہیں کر سکتا کہ بتاؤ، وہ آخرت کس تاریخ کو آئے گی۔ اس کی طرف سے یہ سوال جب بھی ہوگا طنز اور تمسخر کے طور پر ہی ہوگا۔ اس لیے کہ آخرت کے آنے کی تاریخ بیان کرنے اور نہ کرنے کا

مچا رہے تھے^{۲۲}۔ البتہ متقی لوگ^{۲۳} اُس روز باغوں اور چشموں میں ہونگے، جو کچھ اُن کا رب انہیں دیگا اسے خوشی خوشی لے رہے ہونگے^{۲۴}۔ وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے، راتوں کو کم ہی

کوئی اثر بھی اصل بحث پر نہیں پڑتا۔ کوئی شخص نہ اس بنا پر آخرت کا انکار کرتا ہے کہ اس کی آمد کا سال، مہینہ اور دن نہیں بتایا گیا ہے، اور نہ یہ سُن کر اُس کی آمد کو مان سکتا ہے کہ وہ فلاں سال فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو آئے گی۔ تاریخ کا تعین سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ کسی منکر کو اقرار پر آمادہ کر دے، کیونکہ اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دن آنے سے پہلے آخر کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ اس روز واقعی آخرت برپا ہو جائے گی۔

۱۱ فتنے کا لفظ یہاں دو معنی دے رہا ہے۔ ایک معنی یہ ہیں کہ اپنے اس عذاب کا مزہ چکھو۔ دوسرے معنی یہ کہ اپنے اُس فتنے کا مزہ چکھو جو تم نے دنیا میں برپا کر رکھا تھا۔ عربی زبان میں اس لفظ کے اِن دونوں مفہوموں کی یکساں گنجائش ہے۔

۱۲ کفار کا یہ پوچھنا کہ "آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا" اپنے اندر خود یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟ جب ہم اُس کا انکار کر رہے ہیں اور اس کے جھٹلانے کی سزا ہمارے لیے لازم ہو چکی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ اسی لیے جہنم کی آگ میں جب وہ تپ رہے ہونگے اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ اِس فقرے سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ اس نے تم سے نافرمانی کا ظہور ہوتے ہی تمہیں فوراً نہ پکڑ لیا اور سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے وہ تم کو ایک لمبی مہلت دیتا رہا۔ مگر تم ایسے احمق تھے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا یہ مطالبہ کرتے رہے کہ یہ وقت تم پر جلدی لے آیا جائے۔ اب دیکھ لو کہ وہ کیا چیز تھی جس کے جلدی آ جانے کا مطالبہ تم کر رہے تھے۔

۱۳ اِس سیاق و سباق میں لفظ متقی صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی خبر پر یقین لا کر آخرت کو مان لیا، اور وہ رویہ اختیار کر لیا جو حیاتِ اُخروی کی کامیابی کے لیے انہیں بتایا گیا تھا، اور اُس روش سے اجتناب کیا جس کے متعلق

سوتے تھے،[15] پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے،[16] اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل

اُنہیں بتا دیا گیا تھا کہ یہ خدا کے عذاب میں مبتلا کرنے والی ہے۔

[14] اگرچہ اصل الفاظ ہیں اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ، اور ان کا لفظی ترجمہ صرف یہ ہے کہ "لے رہے ہونگے جو کچھ اُن کے رب نے اُن کو دیا ہوگا" لیکن موقع و محل کی مناسبت سے اِس جگہ "لینے" کا مطلب محض "لینا" نہیں بلکہ خوشی خوشی لینا ہے، جیسے کچھ لوگوں کو ایک سخی داتا مٹھیاں بھر بھر کر انعام دے رہا ہو اور وہ لپک لپک کر اسے لے رہے ہوں۔ جب کسی شخص کو اس کی پسند کی چیز دی جائے تو اس لینے میں آپ سے آپ بخوشی قبول کرنے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (التوبہ۔ ۱۰۴)۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات لیتا ہے"۔ اس جگہ صدقات لینے سے مراد محض ان کو وصول کرنا نہیں بلکہ پسندیدگی کے ساتھ ان کو قبول کرنا ہے۔

[15] مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ، کم یا زیادہ، ابتدائے شب میں یا وسطِ شب میں یا آخرِ شب میں، جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابن عباسؓ، انس بن مالک، محمد الباقر، مطرف بن عبداللہ، ابوالعالیہ، مجاہد، قتادہ، ربیع بن انس وغیرہم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصری، اَحنف بن قیس، اور ابن شہاب زُہری کا ہے، اور بعد کے مفسرین و مترجمین نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ اور موقع و محل کے لحاظ سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں یہی معنی اختیار کیے ہیں۔

[16] یعنی وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فسق و فجور اور فواحش میں گزارتے رہے اور پھر بھی کسی استغفار کا خیال تک اُنہیں نہیں آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصا حصہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے رب کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی

اور محروم کے لیے۔ [۱۷]

کا جو حق ہم پر تھا، اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوتی۔ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ کے الفاظ میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ یہ روش انہی کو زیبا تھی۔ وہی اس شانِ عبودیت کے اہل تھے کہ اپنے رب کی بندگی میں جان بھی لڑائیں اور پھر اُس پر پھولنے اور اپنی نیکی پر فخر کرنے کے بجائے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں۔ یہ اُن بے شرم گناہ گاروں کا رویّہ نہ ہو سکتا تھا جو گناہ بھی کرتے تھے اور اوپر سے اکڑتے بھی تھے۔

۱۷ بالفاظِ دیگر، ایک طرف اپنے رب کا حق وہ اِس طرح پہچانتے اور ادا کرتے تھے، دوسری طرف بندوں کے ساتھ اُن کا معاملہ یہ تھا۔ جو کچھ بھی اللہ نے ان کو دیا تھا، خواہ تھوڑا یا بہت، اُس میں وہ صرف اپنا اور اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن کو یہ احساس تھا کہ ہمارے اس مال میں ہر اُس بندۂ خدا کا حق ہے جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔ وہ بندوں کی مدد خیرات کے طور پر نہیں کرتے تھے کہ اُس پر اُن سے شکریہ کے طالب ہوتے اور اُن کو اپنا زیرِ بارِ احسان ٹھیراتے، بلکہ وہ اِسے اُن کا حق سمجھتے تھے اور اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ پھر اُن کی یہ خدمتِ خلق صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ تھی جو خود سائل بن کر اُن کے پاس مدد مانگنے کے لیے آتے، بلکہ جس کے متعلق بھی ان کے علم میں یہ بات آجاتی تھی کہ وہ اپنی روزی پانے سے محروم ہو گیا ہے اس کی مدد کے لیے وہ خود بے چین ہو جاتے تھے۔ کوئی یتیم بچہ جو بے سہارا رہ گیا ہو، کوئی بیوہ جس کا کوئی سر دھرا نہ ہو، کوئی معذور جو اپنی روزی کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکتا ہو، کوئی شخص جس کا روزگار چھوٹ گیا ہو یا جس کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو، کوئی شخص جو کسی آفت کا شکار ہو گیا ہو اور اپنے نقصان کی تلافی خود نہ کر سکتا ہو، غرض کوئی حاجت مند ایسا نہ تھا جس کی حالت ان کے علم میں آئی ہو اور وہ اس کی دستگیری کر سکتے ہوں، اور پھر بھی انہوں نے اس کا حق مان کر اس کی مدد کرنے سے دریغ کیا ہو۔

یہ تین صفات ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو متقی اور محسن قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ انہی صفات نے ان کو جنت کا مستحق بنایا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت پر ایمان لا کر انہوں نے ہر اُس روش سے

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے[۱۸]، اور خود تمہارے اپنے وجود

پرہیز کیا جسے اللہ اور اس کے رسول نے اُخروی زندگی کے لیے تباہ کن بتایا تھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اللہ کی بندگی کا حق اپنی جان لڑا کر ادا کیا اور اُس پر فخر کرنے کے بجائے استغفار ہی کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے اللہ کے بندوں کی خدمت اُن پر احسان سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا فرض اور اُن کا حق سمجھ کر کی۔

اس مقام پر یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ اہلِ ایمان کے اموال میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اُس سے مُراد زکوٰۃ نہیں ہے جسے شرعاً اُن پر فرض کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحبِ استطاعت مومن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے اور اپنے دل کی رغبت سے اس کو ادا کرتا ہے بغیر اس کے کہ شریعت نے اسے لازم کیا ہو۔ ابن عباسؓ، مُجاہد اور زید بن اسلم وغیرہ بزرگوں نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ درحقیقت اِس ارشاد الٰہی کی اصل روح یہ ہے کہ ایک متقی و محسن انسان کبھی اِس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خدا اور اس کے بندوں کا جو حق میرے مال میں تھا، زکوٰۃ ادا کر کے مَیں اُس سے بالکل سبکدوش ہو چکا ہوں، اب مَیں نے اس بات کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے کہ ہر ننگے، بھوکے، مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا پھروں۔ اس کے برعکس جو اللہ کا بندہ واقعی متقی و محسن ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر اُس بھلائی کے لیے جو اُس کے بس میں ہو، دل و جان سے تیار رہتا ہے اور جو موقع بھی اسے دنیا میں کوئی نیک کام کرنے کے لیے ملے اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اُس کے سوچنے کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا کہ جو نیکی مجھ پر فرض کی گئی تھی وہ میں کر چکا ہوں، اب مزید نیکی کیوں کروں۔ نیکی کی قدر جو شخص پہچان چکا ہو وہ اسے بار سمجھ کر برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی نفع کا سودا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا حریص ہو جاتا ہے۔

[۱۸] نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آخرت کے امکان اور اس کے وجوب و لزوم کی شہادت دے رہی ہیں۔ زمین کا اپنا وجود اور اس کی ساخت، اس کا سورج سے ایک خاص فاصلے پر اور ایک خاص زاویے پر رکھا جانا، اُس پر حرارت اور روشنی کا انتظام، اُس پر مختلف موسموں کی آمد و رفت، اس کے اُوپر ہوا اور پانی کی فراہمی، اس کے پیٹ میں طرح طرح کے بے شمار خزانوں کا مہیا کیا جانا، اس کی سطح پر

میں ہیں ۱۹۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں ؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے

ایک زرخیز چھلکا چڑھایا جانا، اس میں قسم قسم کی بے حد و حساب نباتات کا اُگایا جانا، اُس کے اندر خشکی اور تری اور ہوا کے جانوروں کی بے شمار نسلیں جاری کرنا، اس میں ہر نوع کی زندگی کے لیے مناسب حالات اور موزوں خوراک کا انتظام کرنا، اُس پر انسان کو وجود میں لانے سے پہلے وہ تمام ذرائع و وسائل فراہم کر دینا جو تاریخ کے ہر مرحلے میں اس کی روز افزوں ضروریات ہی کا نہیں بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا ساتھ بھی دیتے چلے جائیں، یہ اور دوسری اَن گنت نشانیاں ایسی ہیں کہ دیدۂ بینا رکھنے والا جس طرف بھی زمین اور اس کے ماحول میں نگاہ ڈالے وہ اس کا دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں۔ جو شخص یقین کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہو اس کی بات تو دوسری ہے۔ وہ ان میں اور سب کچھ دیکھ لے گا، بس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی ہی نہ دیکھے گا۔ مگر جس کا دل تعصب سے پاک اور سچائی کے لیے کھلا ہوا ہے وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ہرگز یہ تصور قائم نہ کرے گا کہ یہ سب کچھ کسی اتفاقی دھماکے کا نتیجہ ہے جو کئی ارب سال پہلے کائنات میں اچانک برپا ہوا تھا، بلکہ اسے یقین آجائے گا کہ یہ کمال درجے کی حکیمانہ صنعت ضرور ایک قادرِ مطلق اور دانا و بینا خدا کی تخلیق ہے، اور وہ خدا جس نے یہ زمین بنائی ہے نہ اِس بات سے عاجز ہو سکتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے، اور نہ ایسا نادان ہو سکتا ہے کہ اپنی زمین میں عقل و شعور رکھنے والی ایک مخلوق کو اختیارات دے کر بے نتھے بیل کی طرح چھوڑ دے۔ اختیارات کا دیا جانا آپ سے آپ محاسبے کا تقاضا کرتا ہے جو اگر نہ ہو تو حکمت اور انصاف کے خلاف ہوگا۔ اور قدرتِ مطلقہ کا پایا جانا خود بخود اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کا کام ختم ہونے کے بعد اس کا خالق جب چاہے محاسبے کے لیے اس کے تمام افراد کو زمین کے ہر گوشے سے، جہاں بھی وہ مرے پڑے ہوں، اٹھا کر لا سکتا ہے۔

۱۹۔ یعنی باہر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں، خود اپنے اندر دیکھو تو تمہیں اِسی حقیقت پر گواہی دینے والی بے شمار نشانیاں مل جائیں گی۔ کس طرح ایک خوردبینی کیڑے اور ایسے ہی ایک خوردبینی انڈے کو ملا کر ماں کے ایک گوشۂ جسم میں تمہاری تخلیق کی بنا ڈالی گئی۔ کس طرح تمہیں اُس تاریک گوشے میں پرورش کر کے

وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی، یہ بات حق ہے، ایسی ہی یقینی

تدریج بڑھایا گیا۔ کس طرح تمہیں ایک بے نظیر ساخت کا جسم اور حیرت انگیز قوتوں سے مالا مال نفس عطا کیا گیا۔ کس طرح تمہاری بناوٹ کی تکمیل ہوتے ہی شکم مادر کی تنگ و تاریک دنیا سے نکال کر تمہیں اس وسیع و عریض دنیا میں اس شان کے ساتھ لایا گیا کہ ایک زبردست خود کار مشین تمہارے اندر نصب ہے جو روزِ پیدائش سے جوانی اور بڑھاپے تک سانس لینے، غذا ہضم کرنے، خون بنانے اور رگ رگ میں اس کو دوڑانے، فضلات خارج کرنے، تحلیل شدہ اجزائے جسم کی جگہ دوسرے اجزا تیار کرنے، اور اندر سے پیدا ہونے والی یا باہر سے آنے والی آفات کا مقابلہ کرنے اور نقصانات کی تلافی کرنے، حتیٰ کہ تھکاوٹ کے بعد تمہیں آرام کے لیے سلا دینے تک کا کام خود بخود کیے جاتی ہے بغیر اس کے کہ تمہاری توجہات اور کوششوں کا کوئی حصہ زندگی کی اِن بنیادی ضروریات پر صرف ہو۔ ایک عجیب دماغ تمہارے کاسۂ سر میں رکھ دیا گیا ہے جس کی پیچیدہ تہوں میں عقل، فکر، تخیل، شعور، تمیز، ارادہ، حافظہ، خواہش، احساسات و جذبات، میلانات و رجحانات، اور دوسری ذہنی قوتوں کی ایک انمول دولت بھری پڑی ہے بہت سے ذرائع علم تم کو دیے گئے ہیں جو آنکھ، ناک، کان اور پورے جسم کی کھال سے تم کو ہر نوعیت کی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ زبان اور گویائی کی طاقت تم کو دے دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے تم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے ہو۔ اور پھر تمہارے وجود کی اس پوری سلطنت پر تمہاری اَنا کو ایک رئیس بنا کر بٹھا دیا گیا ہے کہ ان تمام قوتوں سے کام لے کر رائیں قائم کرو اور یہ فیصلہ کرو کہ تمہیں کن راہوں میں اپنے اوقات، محنتوں اور کوششوں کو صرف کرنا ہے، کیا چیز رد کرنی ہے اور کیا قبول کرنی ہے، کس چیز کو اپنا مقصود بنانا ہے اور کس کو نہیں بنانا۔

یہ ہستی بنا کر جب تمہیں دنیا میں لایا گیا تو ذرا دیکھو کہ یہاں آتے ہی کتنا سرو سامان تمہاری پرورش، نشو و نما، اور ترقی و تکمیلِ ذات کے لیے تیار تھا جس کی بدولت تم زندگی کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اپنے اِن اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔

ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے زمین میں تم کو ذرائع دیئے گئے۔ مواقع فراہم کیے گئے۔ بہت سی

چیزوں پر تم کو تصرّف کی طاقت دی گئی۔ بہت سے انسانوں کے ساتھ تم نے طرح طرح کے معاملات کیے۔ تمہارے سامنے کفر و ایمان، فسق و طاعت، ظلم و انصاف، نیکی و بدی، حق و باطل کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں اور ان راہوں میں سے ہر ایک کی طرف بلانے والے اور ہر ایک کی طرف لے جانے والے اسباب موجود تھے۔ تم میں سے جس نے جس راہ کو بھی انتخاب کیا اپنی ذمہ داری پر کیا، کیونکہ فیصلہ و انتخاب کی طاقت اُس کے اندر ودیعت تھی۔ ہر ایک کے اپنے ہی انتخاب کے مطابق اس کی نیتوں اور ارادوں کو عمل میں لانے کے جو مواقع اس کو حاصل ہوئے ان سے فائدہ اٹھا کر کوئی نیک بنا اور کوئی بد، کسی نے ایمان کی راہ اختیار کی اور کسی نے کفر و شرک یا دہریت کی راہ لی، کسی نے اپنے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکا اور کوئی بندگی نفس میں سب کچھ کر گزرا، کسی نے ظلم کیا اور کسی نے ظلم سہا، کسی نے حقوق ادا کیے اور کسی نے حقوق مارے، کسی نے مرتے دم تک دنیا میں بھلائی کی اور کوئی زندگی کی آخری ساعت تک برائیاں کرتا رہا، کسی نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے جان لڑائی، اور کوئی باطل کو سربلند کرنے کے لیے اہلِ حق پر دست درازیاں کرتا رہا۔

اب کیا کوئی شخص جس کی دیدے کی آنکھیں بالکل ہی پھوٹ نہ گئی ہوں، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کی ایک ہستی زمین پر اتفاقاً وجود میں آگئی ہے؟ کوئی حکمت اور کوئی منصوبہ اس کے پیچھے کارفرما نہیں ہے؟ زمین پر اُس کے ہاتھوں یہ سارے ہنگامے جو برپا ہو رہے ہیں سب بے مقصد ہیں اور بے نتیجہ ہی ختم ہو جانے والے ہیں؟ کسی بھلائی کا کوئی ثمرہ اور کسی بدی کا کوئی پھل نہیں؟ کسی ظلم کی کوئی داد اور کسی ظالم کی کوئی بازپرس نہیں؟ اس طرح کی باتیں ایک عقل کا اندھا تو کہہ سکتا ہے، یا پھر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو پہلے سے قسم کھائے بیٹھا ہے کہ تخلیق انسان کے پیچھے کسی حکیم کی حکمت کو نہیں ماننا ہے۔ مگر ایک غیر متعصب صاحبِ عقل آدمی یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان کو جس طرح، جن قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اس دنیا میں پیدا کیا گیا ہے اور جو حیثیت اس کو یہاں دی گئی ہے وہ یقیناً ایک بہت بڑا حکیمانہ منصوبہ ہے، اور جس خدا کا یہ منصوبہ ہے، اُس کی حکمت لازماً یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی بازپرس ہو، اور اس کی قدرت کے بارے میں یہ گمان کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ جس انسان کو

جیسے تم بول رہے ہو۔ؔ

اَے نبیؐ، ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟ جب وہ اُس کے

وہ ایک خورد بینی خلیے سے شروع کر کے اس مرتبے تک پہنچا چکا ہے اسے پھر وجود میں نہ لا سکے گا۔

ٹ؁ آسمان سے مراد یہاں عالمِ بالا ہے۔ رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اور مَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد قیامت، حشر و نشر، محاسبہ و باز پرس، جزا و سزا، اور جنت و دوزخ ہیں جن کے رونما ہونے کا وعدہ تمام کتبِ آسمانی میں اور اس قرآن میں کیا جاتا رہا ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا ہی سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ تم میں سے کس کو کیا کچھ دنیا میں دیا جائے، اور وہیں سے یہ فیصلہ بھی ہونا ہے کہ تمہیں باز پرس اور جزائے اعمال کے لیے کب بلایا جائے۔

ٹ؁ اب یہاں سے رکوعِ دوم کے اختتام تک انبیاء علیہم السلام اور بعض گزشتہ قوموں کے انجام کی طرف پے در پے مختصر اشارات کیے گئے ہیں جن سے دو باتیں ذہن نشین کرانی مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ میں خدا کا قانونِ مکافات برابر کام کرتا رہا ہے جس میں نیکو کاروں کے لیے انعام اور ظالموں کے لیے سزا کی مثالیں مسلسل پائی جاتی ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ دنیا کی اس زندگی میں بھی انسان کے ساتھ اس کے خالق کا معاملہ صرف قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) پر مبنی نہیں ہے بلکہ اخلاقی قانون (MORAL LAW) اس کے ساتھ کار فرما ہے۔ اور جب سلطنتِ کائنات کا مزاج یہ ہے کہ جس مخلوق کو جسمِ طبیعی میں رہ کر اخلاقی اعمال کا موقع دیا گیا ہو، اس کے ساتھ حیوانات و نباتات کی طرح محض طبیعی قوانین پر معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کے اخلاقی اعمال پر اخلاقی قانون بھی نافذ کیا جائے، تو یہ بات بجائے خود اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے کہ اس سلطنت میں ایک وقت ایسا ضرور آنا چاہیے جب اس طبیعی دنیا میں انسان کا کام ختم ہو جانے کے بعد خالص اخلاقی قانون کے مطابق اس کے اخلاقی اعمال کے نتائج پوری طرح برآمد ہوں کیونکہ اس طبیعی دنیا میں وہ مکمل طور پر برآمد نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات جو ان تاریخی اشارات سے ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جن قوموں نے

ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔ اُس نے کہا "آپ لوگوں کو بھی سلام ہے ـــ کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں۲۳" پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا۲۴، اور ایک موٹا تازہ بچھڑا۲۵ لا کر مہمانوں

بھی انبیاء علیہم السّلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پورا رویّہ توحید، رسالت اور آخرت کے انکار پر قائم کیا وہ آخر کار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں۔ تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانونِ اخلاق جو انبیاء کے ذریعہ سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی بازپُرس جو آخرت میں ہونی ہے، سراسر مبنی بر حقیقت ہے، کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھتے ہوئے دنیا میں اپنا رویّہ متعین کیا ہے وہ آخر کار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔

۲۲؎ یہ قصّہ قرآن مجید میں تین مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۵۰۹ تا ۵۱۱۔ جلد سوم، ص ۶۹۶۔

۲۳؎ سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے خود ان مہمانوں سے فرمایا کہ آپ حضرات سے کبھی پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہُوا، آپ شاید اس علاقے میں نئے نئے تشریف لائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے سلام کا جواب دے کر حضرت ابراہیم نے اپنے دل میں کہا، یا گھر میں ضیافت کا انتظام کرنے کے لیے جاتے ہوئے اپنے خادموں سے فرمایا کہ یہ کچھ اجنبی سے لوگ ہیں، پہلے کبھی اس علاقے میں اِس شان اور وضع قطع کے لوگ دیکھنے میں نہیں آئے۔

۲۴؎ یعنی اپنے مہمانوں سے یہ نہیں کہا کہ مَیں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں بلکہ انہیں بٹھا کر خاموشی سے ضیافت کا انتظام کرنے چلے گئے تاکہ مہمان تکلفاً یہ نہ کہیں کہ اس تکلیف کی کیا حاجت ہے۔

۲۵؎ سورۂ ہود میں عِجْلٍ حَنِیْذٍ (بُھنے ہوئے بچھڑے) کے الفاظ ہیں۔ یہاں بتایا گیا کہ آپ نے خوب چھانٹ کر موٹا تازہ بچھڑا بُھنوایا تھا۔

کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں اُن سے ڈرا۔[۶] انہوں نے کہا ڈریے نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔[۷] یہ سُن کر اُس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی، بوڑھی بانجھ![۸] انہوں نے کہا "یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے، وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔[۹]

---

[۶] یعنی جب ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھے تو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اس خوف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اجنبی مسافروں کا کسی کے گھر جا کر کھانے سے پرہیز کرنا، قبائلی زندگی میں اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ وہ کسی بُرے ارادے سے آئے ہیں۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ اُن کے اس اجتناب ہی سے حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں، اور چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا بڑے غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے اس لیے آپ کو خوف لاحق ہوا کہ کوئی خوفناک معاملہ درپیش ہے جس کے لیے یہ حضرات اس شان سے تشریف لائے ہیں۔

[۷] سورۂ ہود میں تصریح ہے کہ یہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کا مژدہ تھا، اور اس میں یہ بشارت بھی دی گئی تھی کہ حضرت اسحاق سے اُن کو حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا پوتا نصیب ہوگا۔

[۸] یعنی ایک تو میں بوڑھی، اوپر سے بانجھ۔ اب میرے ہاں بچہ ہوگا؟ بائیبل کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو سال، اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال تھی (پیدائش، ۱۸ : ۱۷)

[۹] اس قصے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس بندے نے اپنے رب کی بندگی کا حق دنیا میں ٹھیک ادا کیا تھا، اس کے ساتھ عقبیٰ میں تو جو معاملہ ہوگا سو ہوگا، اِسی دنیا میں اُس کو یہ انعام دیا گیا کہ عام قوانینِ طبیعت کی رُو سے جس عمر میں اس کے ہاں اولاد پیدا نہ ہو سکتی تھی، اور اس کی سن رسیدہ بیوی تمام عمر بے اولاد رہ کر اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی، اُس وقت اللہ نے اسے نہ صرف اولاد دی بلکہ ایسی بے نظیر اولاد دی جو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی دوسرا انسان ایسا نہیں ہے جس کی نسل میں مسلسل چار انبیاء پیدا ہوئے ہوں۔ وہ صرف حضرت ابراہیم ہی تھے جن کے ہاں تین پشت تک نبوت چلتی رہی اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبی اُن کے گھرانے سے اُٹھے۔

تجدید مذہب کے مقاصد اور اس کی ذمہ داریاں

عبد الحمید صدیقی

"پل صراط" جس سے گزر کر انسان آخرت میں فائز المرام ہوتا ہے اس کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اُخروی زندگی کی سرحد شروع ہونے سے پہلے اگر کوئی کام "پل صراط" عبور کرنے کی طرح اہم نازک اور صبر آزما ہے تو وہ تجدید دین کا کام ہے۔

ان دونوں میدانوں میں انسانوں کو غیر معمولی حزم و احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے پڑتے ہیں اور ذراسی بھی بے احتیاطی اُسے ناکام ونامراد بنا دیتی ہے۔ اگر آپ ان دونوں مراحل کی نوعیت پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان میں ایک طرف تو کسی شخص کو صبر و ثبات کے ساتھ قدم آگے بڑھانے پڑتے ہیں اور دوسری طرف اسے توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پہلو میں بھی کوئی لغزش ہو جائے تو بڑے تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

آئیے اب یہ دیکھیں تجدید دین کے سلسلے میں ایک مجدد کو کونسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

(۱) ایک مجدد کے لیے سب سے دشوار مرحلہ وقت کے تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہے۔ زندگی رواں دواں ہے اور ہر روز جو آفتاب دنیا پر طلوع ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کچھ نئے مسائل لاتا ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون ہوتا تو تجدید مذہب کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی لیکن زمانے کے ہر آن بدلتے ہوئے تقاضے مذہب کے علمبرداروں سے ہر لمحہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ نئے اُبھرنے والے مسائل کو مذہب کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ حل کیا جائے۔ تجدید مذہب کا کام اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے نئے مسائل کی اہمیت اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جائے پھر معاشرے پر اُن کے اثرات کا تجزیہ کر کے اُن کے چیلنج کو جرأت، حوصلہ مندی

اور تدبّر کے ساتھ قبول کیا جائے۔

وقت کے ان نئے تقاضوں کے مقابلے میں اہل مذہب نے عام طور پر جو مختلف طرز عمل اختیار کیے ہیں انہیں تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک طبقے نے تو سرے سے نئے اُبھرنے والے مسائل کی اہمیت اور اُن کے وزن کو یکسر نظر انداز کیا۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے حضرات نے ہر نئی چیز کو بدعت اور ہر نئی بات کو کفر کہہ کر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ اور جہاں جہاں لوگوں کو مذہب سے انحراف کرتے ہوئے دیکھا انہیں "دردناک عذاب" کی وعید سنائی اور جہاں اُن کا بس چلا وہاں جبر کے ساتھ انہیں نئی روش کو اختیار کرنے سے منع کیا۔ یہ مذہبی طبقہ جسے اسلاف کی مقدس روایات کا امین ہونے کا دعویٰ ہے، اپنی نیکی، پاکبازی، دین کے ساتھ گہری محبت اور اپنی مذہبیت کے باوجود جاہلیت کے سیلاب کو روکنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ دنیا میں جب نئے مسائل کا طوفان امڈتا ہے تو اُسے محض الفاظ کی یورش سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ان مسائل کا تجزیہ کرکے لوگوں کو بتایا جائے کہ ان میں حق و صداقت کا کتنا حصّہ ہے اور باطل کی کس قدر آمیزش ہے۔ جب تک آنے والے مسائل کو اچھی طرح سمجھ کر اُن کے حل کی صحیح راہ معلوم نہ کی جائے محض کفر و الحاد کے فتوے لگانے سے تو کام نہیں بن سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہر عہد کے سارے تقاضے ہی اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان سے صرفِ نظر نہ کیا جا سکے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مسائل بڑے سنگین ہوتے ہیں اور اُن سے اغماض برتنا بڑی کوتاہ اندیشی ہوتی ہے۔ اگر شترمرغ طوفان کے آثار دیکھ کر ریت میں منہ چھپا لے یا کبوتر بلی کی حریص نگاہوں پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی آنکھیں بند کرلے تو اس سے نہ تو طوفان کا خطرہ ٹل سکتا ہے نہ بلی اس کی اس بے بسی کو دیکھ کر اس پر جھپٹنے سے باز رہ سکتی ہے۔ یہی حال جاہلیت کے طوفانوں یا کفر و الحاد کی یورشوں کا ہے۔ یہ طوفان اور یہ حملے صرف خیالات و تصورات کی دنیا ہی میں ہلچل پیدا نہیں کرتے بلکہ مذہبی تہذیب کی جڑیں ہلانے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے ان کے معاملے

میں محض کفر سازی یا فتوے بازی یا غم وغصے کا اظہار انہیں ٹال نہیں سکتے۔ اس حقیقت کا آپ ماضی سے نہیں بلکہ حال کے واقعات سے اندازہ لگائیں۔

دورِ حاضر کی مادی تہذیب ایک خاص نصب العین اور ایک مخصوص نظریۂ حیات لیکر اٹھی ہے اور اس نے پوری دنیا کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب مذہب کے غلط تصور کے نتیجے میں ابھری ہے اس لیے اس کا آغاز ہی باری تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کی نفی اور مادہ کی خدائی کے اعتراف و اقرار سے ہوا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر انسان کے اندر اس باطل خیال کو راسخ کیا جاتا ہے کہ مادہ کی یہ محدود دنیا ہی سبھی کچھ ہے۔ حرکت، نمو، خمیر، سب مادہ کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ جس طرح کائنات کے مختلف شعبے قوانینِ طبیعی کے پابند ہیں اور وہ اضطراری طور پر ایک خاص روش پر چل رہے ہیں بالکل اسی طرح انسان سے بھی خود بخود ایک خاص نوعیت کے افعال سرزد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس بنا پر کوئی اخلاقی قدر بھی کسی مستقل حیثیت کی حامل نہیں۔ اخلاقی اقدار حالات و واقعات کے تحت بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا خیر و شر کے تصورات، حلال و حرام کی تمیز، خوب و ناخوب کے معیار، ثواب و گناہ کے نظریات سب اضافی چیزیں ہیں جو زمان و مکان کے تابع ہیں۔ وقت اور حالات بدلنے کی وجہ سے ان میں خود بخود تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ خیر و شر کا یہ اضافی تصور مذہب کی عین ضد ہے۔ مذہب کی پوری عمارت ہی اس بنیاد پر قائم ہے کہ باری تعالیٰ کی تعلیمات زمان و مکان کی پابند نہیں وہ مستقل اور پائیدار ہیں اور انسان اپنے آپ کو، اپنے حالات کو اور اپنے گرد و پیش کو اُن کا پابند بنانے کا مکلف ہے۔

یہ تصور مذہب کے لیے ایک شدید چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب یہ باطل نظریہ جس کی تائید کے لیے ایک غلط فلسفہ گھڑا گیا ہے، اور غلط تاریخی شواہد مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہر سوچنے سمجھنے والے دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے اس دور میں نئے انداز پر جتنی تاریخی کتب لکھی گئی ہیں وہ سب اسی غلط نظریہ کی شارح و ترجمان ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں بالکل غیر محسوس طور پر یہ خیال راسخ کیا جارہا ہے کہ عہدِ رعائی (PASTORAL STAGE) میں خدا کا تصور اور

اخلاق کے تصورات اُس مخصوص دَور کی پیداوار تھے۔ پھر جب انسانیت عہدِ زراعت (AGRICULTURAL STAGE) میں داخل ہوئی تو یہ تصورات اُس دَور کے بدلے ہوئے تقاضوں کے ساتھ خود بخود بدل گئے۔ اس کے بعد دستکاری کے دَور میں ان میں پھر تبدیلی ہوئی اور سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے بطن سے خدا کے نئے تصور اور حق و باطل کے نئے نظریہ کو جنم دیا۔

اسی طرح معاشرتی مسائل کو دیکھیے۔ ان کے بارے میں بھی اس تہذیب نے لوگوں کے اندر یہ عام احساس پیدا کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مستقل اخلاقی قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ وقت اور حالات کے ساتھ اُن کی افادیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً عہدِ رعائی میں گلہ بانی کے لیے زیادہ سے زیادہ افراد درکار ہوتے تھے۔ اس لیے کثرتِ اولاد ایک رحمت تھی۔ یہی حال عہدِ زراعت اور عہدِ دستکاری میں رہا۔ لیکن دورِ جدید میں جبکہ مشینوں کی فراوانی نے انسانی محنت کی افادیت غیر معمولی حد تک کم کر دی ہے، اولاد کی کثرت رحمت کی بجائے زحمت ہے۔

یہی حال سُود کا ہے۔ پہلے ادوار میں تجارت کا یہ انداز نہ تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ ہر شخص اپنی محنت اور سرمایے سے کام کرتا تھا اور اگر وہ کبھی کوئی چیز دوسرے سے مستعار لیتا تھا تو وہ یہ کام شدید مجبوری کے عالم میں کرتا تھا اس لیے حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سُود کی حوصلہ شکنی کی جاتی۔ چنانچہ اہلِ مذہب نے اسے حرام قرار دیا۔ لیکن آج روپیہ نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے دوسرے سے مستعار لیا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو وسیع پیمانے پر اشیاء کی پیدائش کا انتظام ممکن نہیں کثیر پیدا آوری اور زود پیداداری کے لیے سرمایے کی زیادہ سے زیادہ تعداد بنیادی ضرورت ہے۔

سرمایے کی اس غیر معمولی اہمیت نے دولت کے سارے تصورات کو بدل دیا ہے۔ فقر و استغناء، مال و متاع کو آزمائش سمجھ کر اس کے بارے میں حزم و احتیاط، جو مذہبی زندگی کے بنیادی لوازم ہیں اُن کے بارے میں لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویے یکسر بدل گئے اور دَورِ جدید میں انسان نے دولت کو قاضی الحاجات سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی ہے۔

ان حالات میں کون سا ایسا شخص ہے جو ان حقائق کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ جن بے جان

سکوں کی محبت نے لوگوں کو خدا کی محبت سے غافل کر دیا ہے اور عزو شرف کی ساری قدروں کو بدل کر رکھ دیا ہے ان کے بارے میں کبھی اغماض نہیں برتا جا سکتا۔ اس مسئلہ کو جب تک صحیح طور پر حل نہ کیا جائے اس وقت تک مذہب کی دعوت لوگوں کے لیے اپنے اندر کوئی کشش نہ رکھے گی۔ محض یہ بات کہہ دینے سے کہ سُود حرام ہے یہ پیچیدہ مسائل حل نہیں ہونگے۔ انسان کو جب تک ان کا کوئی خاطر خواہ اور معقول حل نظر نہ آئے اس وقت کوئی دعوت بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ سُود واقعی حرام ہے، یہ ایک سنگین معاشرتی اور معاشی برائی ہے، اس نے مزدوروں کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا ہے۔ اس نے کساد بازاری، بے روزگاری، طبقاتی منافرت کو جنم دیا ہے لیکن عوام کو یہ حقائق باور کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے مغرب کے مختلف معاشی نظاموں کو سمجھیں۔ ان کے اندر جو خامیاں ہیں انہیں طشت از بام کریں اور عملی واقعات سے اُن کی مضرتیں ثابت کریں۔ پھر ان نظاموں کے مقابلے میں اُس نظام کا نقشہ پیش کریں جو ہمیں مذہب نے دیا ہے اور دلائل سے واضح کریں کہ اگر اس نقشے کے مطابق معاشی نظام کی تشکیل کی جائے تو وہ انسانیت کے اخلاقی، روحانی اور مادی تقاضوں کو بطریقِ احسن پُورا کر سکے گا۔

اس ضمن میں یُوں تو بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتماعی اور معاشی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک آزاد ہو۔ مذہب چونکہ بنیادی طور پر ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے اس میں خارجی محرکات سے کہیں زیادہ داخلی محرکات انسان کو سرگرمِ عمل کرتے ہیں۔ اس بنا پر مذہب سب سے پہلے "اندر کے انسان" کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن اس وقت مغرب نے ہم پر جو معاشی اور معاشرتی نظام مسلط کیا ہے اس میں انسان اجتماعی جکڑ بندیوں کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہے اور حیاتِ اجتماعی کا تند و تیز دھارا اُسے غیر ارادی طور پر جس طرح چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ بیچارا اپنے لیے اپنی پسند کے مطابق رزق تلاش نہیں کر سکتا۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہ حضرات جو رزقِ حلال کے حصُول کے انتہائی آرزومند ہیں وہ بھی اس مقدس آرزو کو صرف سینوں میں پالنے

پر اکتفا کرتے ہیں اور عملی زندگی میں اسی حرام سے پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو خدا کے باغی ناجائز طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اب اگر تجدید و احیائے دین کا کوئی علمبردار اجتماعی زندگی کی ان جکڑبندیوں اور ان کے اخلاقی مفاسد کو نظر انداز کر کے عوام کو مذہبی طرز زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنی اس مقدس دعوت کے ساتھ ساتھ ان مفاسد پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ وہ ان جکڑبندیوں کو کس طرح ڈھیلا کر سکتا ہے تاکہ لوگوں کے ضمیر اور ان کی روح آزاد ہو اور وہ خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے رزقِ حلال کی تلاش کریں اور حرام خوری سے دستکش ہوں۔

دوسری مثال پردہ کی ہے آج مسلمانوں میں بے پردگی کا جو خطرناک رجحان بڑھ رہا ہے اُسے اس ملت کے سارے دردمند افراد بڑی تشویشناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مغربیت کے اس سیلاب نے ایک مرتبہ اُن کی عائلی زندگی کو برباد کر دیا تو پھر اس ملت کو سنبھلنے میں صدیاں لگیں گی۔ عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور وہ اگر ایک دفعہ گھر سے نکل آئی تو پھر اُسے گھریلو ذمہ داریاں قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ نہ کیا جا سکے گا اور یہاں بھی اخلاقی بے راہ روی کا وہی طوفان امڈ آئے گا جس نے آج مغربی زندگی کو دردناک عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ احساس اپنی جگہ صحیح اور درست ہے اور جن خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ بھی بے پردگی کے ناگزیر نتائج ہیں۔ لیکن یہ سوچیے کہ کیا ہم اپنے معاشی، سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھ کر محض وعظ و تلقین سے اس طوفان کو روک سکتے ہیں۔ ہم پر آہستہ آہستہ جو معاشی نظام اپنا تسلط قائم کر رہا ہے بے پردگی، آوارگی اس کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام میں ایک مختصر سا طبقہ تو دن بدن امیر ہوتا چلا جا رہا ہے مگر دوسری طرف انسانوں کی عظیم اکثریت اتنی مفلوک الحال ہو گئی ہے کہ اس کے لیے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں نہ صرف مرد بلکہ عورت بھی اس بات پر مجبور ہے کہ وہ کمائے اور کسی دوسرے

پر بار نہ بنے ۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر عزت و آبرو کے ساتھ کمانے کی کوئی معمولی گنجائش بھی باقی نہیں رہی ۔ اُسے رزق کی تلاش میں بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی مراکز کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور وہاں بے بس غلام بن کر چند سکوں کے حصول کے لیے محنت و مشقت اٹھانا پڑتی ہے ۔ ان حالات میں اگر ایک عورت باپردہ رہنا بھی چاہے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عزمِ صمیم بھی کرے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ ہو سکتا ہے کہ چند باہمت خواتین اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ طبقۂ نسواں کی عظیم اکثریت اجتماعی دباؤ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگی اور وہ دین کی ان ساری قدروں کو اسی طرح پامال کریگی جس طرح کہ انہیں مغرب میں پامال کیا گیا ہے اور اس معاملے میں کوئی بڑی سے بڑی دردمندانہ نصیحت بھی کارگر ثابت نہ ہوگی ۔

یہ چند مثالیں جو اوپر پیش کی گئی ہیں کوئی ایسی ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کی نوعیتوں اور ان کے وسیع اثرات کو سمجھنے کے لیے کوئی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت درکار ہو ۔ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن سے ہر فرد پوری طرح واقف ہے اور جن کی تلخیوں کو ہر شخص اپنی زندگی میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے مگر بے بس ہونے کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے ۔

ہم نے ماضی میں سے چند مثالیں دینے کی بجائے زمانۂ حال کے کچھ واقعات صرف اس لیے درج کیے ہیں کہ تجدید و احیائے دین کے کام کی نوعیت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کی نزاکت کا کچھ اندازہ ہو سکے ۔ جب جاہلیت کسی قوم پر یلغار کر کے اُس کے پورے نظامِ زندگی میں سرایت کر جائے تو اس وقت سب سے پہلے جاہلیت کے زور کو توڑنے کے لیے اُس کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا پڑتی ہے اور یہ کام اُسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہمیں اس کی قوت کا پوری طرح اندازہ ہو ، اس کے کمزور محاذوں کا اچھی طرح علم ہو ، اس کے حملوں کی تکنیک اور اس کی سازشوں کے انداز سے پوری پوری واقفیت ہو اور پھر اس قوت کا مقابلہ کرنے کا عزم ، اُس سے نبرد آزما ہونے کا

حوصلہ اور تدبّر ہو۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک مجدّد کو اُس دین اور مذہب کے اندر بھی گہری بصیرت حاصل ہونی چاہیے جس کی تجدید کا عزم لیکر وہ اٹھتا ہے کیونکہ اگر وہ اس دین اور مذہب کے مقصد و منہاج، اُس کے مزاج، اس کے تاریخی ارتقاء کو کما حقہٗ نہیں سمجھتا تو وہ تجدید کے نازک فرض کو حُسنِ نیت اور اخلاص کے باوجود بخوبی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس ضمن میں اُس کے لیے ان چند امور کا اچھی طرح جاننا انتہائی ضروری ہے۔

(۱) تعلیماتِ الٰہی کے ماخذ پر ایک مجدّد کی نہایت گہری نظر ہونی چاہیے۔ مذہب خواہ کوئی ہو اُس کے ماخذ بالعموم دو ہی ہوتے ہیں۔ ایک الہامی کتاب اور دوسرے جس مقدس ہستی پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کا اپنا عمل، کیونکہ اس کا یہ عمل ہی کتاب الٰہی کی صحیح تفسیر و تعبیر ہوتی ہے اور یہ بھی دین میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ خود کتاب اللہ۔ اس تعبیر سے ایک طرف اللہ کے دین کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے ہدایت اور رہنمائی ملتی ہے اور دوسری طرف فکر و نگاہ کے وہ زاویے اور احساسات جذبات کے وہ پیکر بنتے ہیں جو دین ترتیب و تشکیل دینا چاہتا ہے۔ ایمان، خالق و مالک، کائنات اور ابنائے نوع کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک مخصوص قلبی کیفیت کا نام ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک ایک انسان فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی یہ حالت پیدا نہیں کر لیتا اس وقت تک وہ دین اور اس کے مطالبات اور اُس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ اور یہ چیز دین کے سرسری سے مطالعہ سے تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ انسان عقلِ سلیم اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کرے کہ نہ صرف اُس کے قلب و نگاہ دین کے نور سے منور ہو جائیں بلکہ یہ نور اس کے ضمیر، اس کے وجدان اور اس کے احساس میں پوری طرح سرایت کر جائے اور جہاں کہیں اُسے باطل کی کوئی تاریکی نظر آئے تو اس کی روشن ضمیری فوراً اس کا ادراک کرے۔

یہ مقام صرف مذہب کے ماخذ کی زبان جاننے اور اس کے سطحی مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کے حصول کے لیے دین کی سچی محبت، اُسے اپنانے اور دنیا میں سربلند کرنے کا جذبۂ صادق اور اسی وجہ سے اسے سمجھنے کی گہری آرزو نہایت ضروری ہے۔

امام شافعیؒ نے جو بات مفتی کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے وہی بات مجدد کے لیے بھی ضروری ہے:

"خدا کے دین میں فتویٰ دینا صرف اُسی شخص کے لیے جائز ہے جو کتاب اللہ میں گہری بصیرت رکھتا ہو، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، تاویل و تنزیل، مکی و مدنی سورتوں کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ رسول کے بارے میں گہرا علم رکھتا ہو۔ لغت، شعر اور ہر وہ چیز جو قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کام آتی ہو اُن کا عالم ہو۔ اس کے علاوہ منصف مزاج اور متوازن ذہن کا ہو تاکہ حق و انصاف کے ساتھ کوئی رائے دے سکے۔ مختلف ممالک اور علاقوں کے باشندوں کے مزاج، عادات و اطوار کو بھی سمجھنے والا ہو (کیونکہ ان کے اندر جو فطری اختلاف پایا جاتا ہے اسے عملی زندگی میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) اور سب سے بڑھ کر استنباط و اجتہاد کا ملکہ رکھتا ہو۔"[1]

(۲) اسی ضمن میں ابن مبارک سے ایک ایسا قول منقول ہے جو فہمِ دین کے صحیح معیار کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے یحییٰ بن اکثم سے دریافت کیا کہ مفتی میں دین کے معاملے میں کونسی خصوصیات ہونی چاہییں تو انہوں نے کہا: "حدیث کا حافظ اور رائے میں بصیرت رکھنے والا۔"

پھر انہوں نے رائے کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد مصالح اور اُن علتوں کی پوری واقفیت ہے جن پر اللہ کی شریعت قائم ہے۔[2]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باقاعدہ ایک

---

[1] منقول از اعلام الموقعین تالیف حافظ ابن قیم۔ جلد اوّل ص ۴۶

[2] ایضاً ص ۴۸ جلد اوّل

جامع باب تحریر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان علتوں کو سمجھے بغیر احکام الٰہی سمجھے نہیں جا سکتے۔ ان کی تصریحات قابلِ غور ہیں:

"دینِ الٰہی میں کوئی شے عبث نہیں ہوتی۔ ان افعال کے ساتھ رضاء الٰہی یا اس کی ناراضگی کا تعلق ضرور کسی نہ کسی سبب کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ ان افعال کے ساتھ درحقیقت کچھ ایسے امور اور علتیں وابستہ ہوتی ہیں جو باری تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بنتی ہیں۔ ان امور اور علتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

- بِرّ و اِثم۔ نیکی اور گناہ یعنی وہ امور جو افراد اور معاشرے کی بھلائی اور برائی کے ذمہ دار ہیں۔

- دوسرے وہ امور جن کا مقصد دین کے اندر تحریف کا سدباب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین عوام کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ شرعی احکام کے پیچھے جو مصالح اور علتیں موجود ہیں وہ ایسی نوعیت کی ہوں جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آسکیں۔ مثال کے طور پر شراب نوشی کو اسلام میں جو حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کے مفاسد اور خرابیاں اتنی واضح ہیں کہ انہیں ہر شخص جانتا ہے۔ شراب کا رسیا احسان اور نیکی سے دُور ہو جاتا ہے۔ خالق اور خلق کے حقوق سے غفلت برتتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس سے معاشرتی، تمدنی اور عمرانی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ یہ تمام امور اکثر و بیشتر شراب نوشی کے لوازمات ہیں اور اسی بنا پر شراب کی تمام اقسام سے منع کیا گیا ہے۔[1]"

یوں تو شرعی احکام کی علتوں کا جاننا ہر شخص کے لیے مفید ہے لیکن ایک مجدد کے لیے تو انتہائی ضروری ہے۔ مجدد کا کام مسند افتاء پر بیٹھ کر صرف فتوے صادر کرنا نہیں ہوتا بلکہ نظامِ شریعت کو عملاً نافذ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس تگ و دو میں اُس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک طرف لوگوں کے مزاج کو جانے، اُن کے اندر دین سے انحراف اور بغاوت کے جو رجحانات پیدا ہو چکے ہیں

---

[1] جزو اول ص ۹۳

اُن کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھے اور پھر ان سارے حالات کو سامنے رکھ کر وہ طریقہ اختیار کرے جس سے لوگ بغاوت کی راہ ترک کرکے دین کی راہ اختیار کریں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام کو اُس آسانی کے ساتھ تو سرانجام نہیں دیا جاسکتا جس آسانی کے ساتھ کسی خالی جگہ پر خیمے کو گاڑا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے کسی مجدد کو دین و شریعت کے پُورے نظام پر ایک متوازن نگاہ ڈال کر سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ دین کے مختلف احکام کو جاری کرنے کے لیے تقدیم و تاخیر کی کونسی ترتیب قائم کی جائے۔ اس ترتیب میں مصالح اور علتوں کی گہری واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر کوئی شخص ان سے ناواقف ہے تو وہ اصول و فروع کے درمیان امتیاز نہیں کرسکتا اور اس طرح دین کے عملی نفاذ کے معاملے میں ٹھوکریں کھا سکتا ہے۔

(۳) مجدد کے لیے تیسری بڑی چیز خدا خوفی، نیکی، پرہیزگاری اور ملت کے اہلِ رائے کا اعتماد ہے۔ دین محض علم کا نام نہیں بلکہ اس میں عمل بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ علم۔ اگر ایک شخص اللہ کے دین کی تجدید کا دعوی کرتا ہے تو اس کی دعوت کی طرف لوگ اس وقت تک کبھی متوجہ نہ ہونگے جب تک کہ اُس کی زندگی میں وہ دین کی پوُری جھلک نہ دیکھ لیں کسی شخص کی محض دینی معلومات کی وسعت لوگوں کو اس کا عقیدتمند نہیں بنا سکتی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے لوگوں کو اس امر کا اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ شخص جو تجدیدِ دین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اُسے واقعی اللہ کے دین سے گہری محبت ہے، اپنے خالق و مالک پر یقین کامل ہے اور نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا سچا جذبہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اس سعی و جہد کا مقصود کچھ ذاتی منافع یا عزت و شہرت کا حصول نہیں بلکہ محض مالک الملک کی رضا جوئی ہے۔ اپنے خالق و مالک کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے اور وہ صرف اس کے اعتماد اور بھروسے پر اِس فرض کو سرانجام دے رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا کام ننھی منی چڑیوں، جانوروں، ہواؤں سے تو لے لیا ہے لیکن کبھی بھی خدا سے غافل لوگوں سے نہیں لیا۔ دین کی سب سے زیادہ خدمت اُنہی لوگوں نے کی ہے جو بڑے متقی، پرہیزگار، قانع، احکامِ الٰہی کے پابند اور مخلص تھے۔ مجرد وسعتِ علمی کو کبھی کوئی مقام حاصل نہیں ہوا۔ ابوالفضل اور فیضی کی وسیع علمی معلومات

اور اُن کی ذہانت و فطانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ زبان پر انہیں عبور تھا، منطق اور فلسفہ کے یہ لوگ ماہر تھے۔ بات کرنے کا ڈھنگ انہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود مجددیت کی خلعت سے مجدد الف ثانی نوازے گئے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ مجدد صاحب کے دل میں دین کی سچی تڑپ موجود تھی اور اُن کے مقابلے میں ابوالفضل اور فیضی کے سامنے بادشاہ کی خوشنودی اور اس کے نتیجے میں دنیاوی عزوجاہ اور مادی منافع کا حصول تھا۔ دین کی خدمت کا شرف انہیں خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آیا ہے جنہوں نے دین کو ہی اپنی زندگی کا منتہائے مقصود اور گوہر مراد سمجھا ہے اور اسے کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ رب العزت کی غیرت نے اس دین کو بعض دوسرے مقاصد کے حصول کا کبھی ذریعہ نہیں بننے دیا۔ اگر کچھ لوگوں نے مختصر سے عرصے کے لیے معدودے چند لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کر دیا تو جلد ہی اُن کی فریب کارانہ سرگرمیوں کا پردہ چاک کر دیا گیا۔ امتِ مسلمہ کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ یہاں مختلف اوقات میں مختلف من چلوں نے دین کے اندر کس قسم کی رخنہ اندازیاں پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں بعض حضرات اپنی معلومات کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ممیز و ممتاز تھے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک شخص کے اجتہادات بھی عوام میں قبول نہ کیے جا سکے۔ جب ہم ان متجددین کی ناکامیوں کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس بنا پر ناکام رہے کہ عوام کو ان کی خدا خوفی، خلوص نیت اور دیانت پر بھروسہ نہ تھا۔

بعض لوگوں نے غلطی سے تجدید کو تجدّد کا ہم معنی سمجھ لیا ہے اُن کے نزدیک تجدید کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ دین کے اندر ایسی نئی نئی باتیں نہ پیدا کی جائیں جن کا نہ تو پہلے کوئی نام و نشان ملتا ہو اور نہ اُس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہوں۔ مجددین کا انداز تجدد پسندوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ مجددین دین کے اندر کوئی نئی طرح نہیں ڈالتے بلکہ دین کی پرانی روایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے تحت نئے طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

برطانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل

ابوالاعلیٰ مودودی

[ماہ اگست کے آخر میں یوکے اسلامک مشن کی جو سالانہ کانفرنس لندن میں ہوئی تھی، اس کے لیے یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ کر کے بھیجی گئی تھی]

الحمدُ للّٰہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادِہِ الّذین اصطفیٰ

میرے دُور افتادہ بھائیو، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے مشن کی اِس کانفرنس کے موقع پر مَیں سب سے پہلے آپ کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے ارادوں میں خلوص، آپ کی کوششوں میں برکت، اور آپ کے کاموں میں رُشد و ہدایت عطا فرمائے۔ آپ اگرچہ جسمانی طور پر بہت دُور ہیں، مگر دل سے بہت قریب ہیں، اور مومن جہاں بھی ہو، مومن کے دل سے قریب ہی رہتا ہے، کیونکہ جو رشتہ اُس کو دوسرے مومن سے جوڑتا ہے وہ دل ہی کا رشتہ ہے۔

میرے عزیز بھائیو، آپ جس سرزمین میں مقیم ہیں اُس کے متعلق آپ کا مشاہدہ میری بہ نسبت زیادہ قریب کا ہے، اس لیے یہ بات بظاہر کچھ بے محل سی ہوگی کہ مَیں یہاں سے بیٹھ کر اس کے بارے میں آپ کو کچھ بتاؤں۔ مگر جو باتیں آج مجھے آپ سے کہنی ہیں ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ سب سے پہلے ایک مسلم گروہ ہونے کی حیثیت سے اپنے لیے اس سرزمین کی پوزیشن، اور اُس کے لیے اپنی پوزیشن کو اپنے ذہن میں اچھی طرح تازہ کر لیں۔

یہ سرزمین کبھی نورِ اسلام سے منور نہیں رہی ہے۔ اِس کا معاشرہ ابتدا سے غیر مسلم ہے۔ ایک زمانہ تک یہاں پوری شدت کے ساتھ ایک مسخ شدہ مذہبِ آسمانی کا دَور دورہ رہا ہے

جس میں توحید کے ساتھ شرک کی آمیزش ہے، رسالت و وحی کو ماننے کے ساتھ غلو فی الدین کی وجہ سے خدا کے رسول کو خدا کا بیٹا بنا لیا گیا ہے، عقیدۂ آخرت کے ساتھ کفارہ کا عقیدہ شامل ہو گیا ہے، اور خدا کی شریعت کو لعنت سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے جس کی جگہ پہلے مذہبی پیشواؤں کی خود ساختہ شریعت نے لی اور بعد میں دین سے بے نیاز قانون سازی نے لے لی۔ اس مذہب کے تسلط و اقتدار کی وہ شدت تو اب باقی نہیں رہی ہے، مگر اس کے تمام بنیادی افکار و عقائد اب بھی پوری فضا پر چھائے ہوتے ہیں۔

خدا کے حقیقی دین سے جو دوری اس مذہب کی بدولت یہاں پیدا ہو چکی تھی، اُس کو صلیبی لڑائیوں نے ہزار درجہ زیادہ بڑھا دیا، اور یہ دُوری اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف نفرت اور تعصب میں تبدیل ہو گئی۔

اس کے بعد یہاں لادینی فلسفوں کا طوفان اٹھا جس نے ایک مادہ پرستانہ تہذیب کو جنم دیا۔ اور چونکہ یہی وہ دور تھا جس میں اِن لوگوں کو بے مثال مادّی ترقی نصیب ہوئی، دنیا بھر سے لوٹی اور کمائی ہوئی دولت کی ریل پیل اِن کے ہاں ہونے لگی، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں اِن کے اقتدار کے پھریرے اڑنے چلے گئے، اس لیے ایک طرف اپنی گمراہی پر ان کا غرور بڑھتا چلا گیا، اور دوسری طرف تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق، غرض اِن کے پُورے نظامِ زندگی میں وہ اوصاف جڑ پکڑتے چلے گئے جو اپنے اصول اور مظاہر، دونوں میں بہت بڑی حد تک اسلام کی عین ضد ہیں۔

اپنے عروج کے اِس دور میں بہت سے مسلمان ملک اِن کی زد میں آئے اور جگہ جگہ مسلمان قومیں سالہا سال تک اِن سے مغلوب رہیں۔ اِس صورتِ حال کا ایک اثر اِن پر پڑا، اور دوسرا اثر ہم پر۔ اِن پر اس کا اثر یہ پڑا کہ اسلام اور مسلمان، دونوں اِن کی نگاہ سے گر گئے، صلیبی لڑائیوں کے زمانے کی نفرت پر حقارت کا اضافہ اور ہو گیا، اور پرانا تعصب اپنی جگہ جُوں کا توں قائم رہا۔ ہم پر اُس کا اثر یہ پڑا کہ ہم اِن سے صرف مغلوب ہی نہیں ہوئے، مرعوب بھی ہو گئے۔ اِن کے سیاسی و معاشی اقتدار نے ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب کی جڑیں ہلا دیں۔ اِن کے قوانین نے ہمارے نظامِ زندگی

کا نقشہ بدل ڈالا۔ اِن کی تعلیم نے ہمارے افکار و نظریات اور عقائد تک میں ہل چل برپا کر دی۔ اور ان کے غالب اثرات نے ہمارے اخلاق ہی میں نہیں، ہمارے گھروں میں گھس کر ہماری معاشرت کی بنیادی خصوصیات تک میں ترمیم کر ڈالی۔ اِس مغلوبیت کے دور میں جس نے جتنا زیادہ ان کا اثر قبول کیا اُسے اُتنا ہی زیادہ ہمارے ہاں عروج نصیب ہوا۔ مگر خاص طور پر ہمارے جو افراد اِس سرزمین میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ان کی بہت بڑی اکثریت اندر سے باہر تک پوری طرح انہی کے رنگ میں رنگ گئی اور واپس جا کر یہی انگریزیت کا مکمل نمونہ پائے ہوئے لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے رہنما و سربراہ کار بنتے رہے۔

اب جس نئے دور میں ہم داخل ہوتے ہیں اِس میں صرف دو حیثیتوں سے تغیّر ہوا ہے۔ ایک یہ کہ ہم سیاسی حیثیت سے اِس سرزمین کے باشندوں کی غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دوسری جنگِ عظیم نے اِن کے اقتدار کی کمر توڑ دی ہے اور اِن کو خدا کی زمین پر وہ غلبہ حاصل نہیں رہا ہے جو اِس جنگ سے پہلے تک تھا۔ لیکن عملاً اس لحاظ سے آج تک کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے کہ ان کے نظریات، اِن کے علوم، اِن کی تہذیب، اِن کے تمدّن، ان کے اخلاق، اور اِن کے طور طریقوں کا ہم پر جو غلبہ پہلے تھا وہی اب بھی ہے۔ ہر معاملہ میں ہم اِن کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اندھے مقلّد ہیں، اور اِن کی سیاسی و معاشی فوقیت گھٹ جانے سے جو جگہ خالی ہوتی تھی، اسے انہی کے بھائی بند، امریکہ والوں نے بھر دیا ہے۔

حضرات، یہ ہے وہ ملک اور معاشرہ جس میں آپ رہتے ہیں۔ آپ کے اور اُس کے درمیان جو نسبتیں اب تک رہی ہیں اُن کا یہ مختصر تجزیہ مَیں نے آپ کے سامنے اس لیے پیش کیا ہے کہ آپ یہاں اپنی پوزیشن کو ٹھیک ٹھیک ذہن میں رکھ کر اُن مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں جو یہاں کا قیام اختیار کرکے آپ کے لیے پیدا ہوتے ہیں، اور اُس فرض کو پہچانیں جو یہاں رہتے ہوئے ایک مسلم گروہ کی حیثیت سے آپ کے اوپر عائد ہوتا ہے۔ پہلے زیادہ تر مسلمان یہاں عارضی طور پر تعلیم یا کاروبار کے لیے آتے تھے۔ مگر اب یہاں آپ کی ایک مستقل آبادی بس رہی ہے، اور اندازہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے

متوطن مسلمانوں کی اچھی خاصی جماعت آئندہ برطانوی معاشرے کا ایک جزبن کر رہے گی۔ اس لیے جن مسائل کی طرف میں آپ کو توجہ دلا رہا ہوں وہ عارضی و وقتی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوامی نوعیت کے ہیں۔

اس سلسلے میں چھوٹے چھوٹے امور کو چھوڑ کر میں آپ کو صرف چند اہم ترین مسائل کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

سب سے پہلا اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ آپ کو یہاں اپنے دین، اپنی تہذیب، اپنے اخلاق، اپنے اصولِ معاشرت، اور فی الجملہ اپنی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لیے سخت کوشش کرنی ہوگی۔ کیونکہ آپ ایک ضعیف معاشرے سے نکل کر ایک بہت طاقتور معاشرے میں آگئے ہیں جس کے زبردست اثرات سے خود اپنے ملک میں بھی بچ کر رہنا آپ کے لیے مشکل ثابت ہوچکا ہے یہاں اگر آپ نے اس معاملہ میں ذراسی بھی غفلت برتی تو آپ اس معاشرے میں جذب ہوکر اپنی ہستی گم کردیں گے اور محض نسل و رنگ کا فرق آپ کی انفرادیت کو زیادہ دیر تک نہ بچا سکے گا۔ اس لیے آپ کو اپنے تمام وسائل و ذرائع جمع کرکے ایسی تدبیریں اختیار کرنی چاہییں جن سے اس ملک کے متوطن مسلمانوں میں وحدت پیدا ہو، اُن کے درمیان باہمی روابط زیادہ سے زیادہ بڑھیں، ہر طرح کی چھوٹی چھوٹی تفریقیں ختم کرکے ایک ملت ہونے کا احساس اُن میں بیدار کیا جائے، غلط راہ پر جانے والوں کو سنبھالا جائے، اخلاق اور معاشرت کے بگاڑ کو روکا جائے، اور یہاں کے مسلمانوں میں دین کا شعور اور اس کا علم پھیلانے کے لیے نہ صرف تعلیمی و تبلیغی اجتماعات اور نشر و اشاعت کا انتظام کیا جائے، بلکہ ایسے کارکنوں کا ایک منظم گروہ تیار کیا جائے جو مسلمان افراد تک پہنچ کر انہیں اسلام سے وابستہ رکھنے کی کوشش کریں، اور ان کے انفرادی حالات کو سمجھ کر اُن مشکلات کو رفع کرنے کی فکر کریں جو انہیں مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے میں پیش آرہی ہوں۔

دوسرا مسئلہ جو اپنی اہمیت میں اس سے کچھ کم نہیں ہے، آپ کی آئندہ نسلوں کا ہے، جو یہاں اس کفر کے ماحول میں پیدا ہو رہی ہیں اور تعلیم و تربیت پا رہی ہیں۔ آپ اُن علاقوں سے آرہے

ہیں جہاں آپ کو مسلمان معاشرہ میسر تھا۔اس کے باوجود آپ کے لیے کفر کے اِس غالب ماحول میں اپنے ملّی تشخص کو برقرار رکھنا اور اپنی زندگی کو غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھنا دشوار ہو رہا ہے۔ پھر ان بچوں کا کیا انجام ہوگا جو اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں گے، اِسی تہذیب کو چاروں طرف محیط دیکھیں گے اور یہیں تعلیم و تربیت پائیں گے ؟ آپ نے اگر اُن کے مستقبل کی فکر نہ کی، اور ان نسلوں کو سنبھالنے کے لیے اپنی متحدہ کوششوں سے کوئی مناسب انتظام نہ کیا، تو آپ خود چاہے اپنے آپ کو اس بحرِ شور میں غرق ہونے سے بچالے جائیں، اپنی اولاد کو نہ بچا سکیں گے۔ یہ مسئلہ برطانیہ میں رہنے والے تمام مسلمانوں کی خاص توجہ کا محتاج ہے۔کسی تاخیر اور تساہُل کے بغیر اس پر پُوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اور جو بھی بااثر مسلمان اُس ملک کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں انہیں مِل جُل کر ایسے انتظامات کرنے چاہییں جو وہاں کے مسلمان بچّوں کو دینی تعلیم و تربیت دینے کے لیے مناسب اور ممکن ہوں۔

یہ دو امور تو اس حیثیت سے اہم ہیں کہ اُن پر آپ کے بقا کا انحصار ہے لیکن مسلمان کی ہستی کا بقا صرف اُس کی ذات کے لیے مطلوب نہیں ہوتا بلکہ اُس سے زیادہ بڑے ایک اور مقصد کے لیے مطلوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے آپ کو یہ موقع دیا ہے کہ پہلے جو لوگ اپنی گمراہی کا جھنڈا لیے کر کبھی فاتحانہ شان سے آپ کے ہاں پہنچے تھے، اب خود ان کے ہاں آپ اپنی ہدایت کا جھنڈا لیے ہوئے فاتحانہ شان سے نہ سہی مبلغانہ شان ہی سے پہنچ جائیں۔ ابتدا سے یہ سرزمین نورِ اسلام سے محروم ہے۔ آپ کو تقدیرِ الٰہی نے اسلام کا نمائندہ بنا کر یہاں لا بٹھایا ہے۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ یہاں اسلام کی غلط نمائندگی کر کے اپنے ساتھ اپنے دین کو بھی رُسوا کریں اور خدا کے حضور اپنی غلط کاریوں کے ساتھ اِن کی بھی مزید گمراہی کا وبال اپنے سر لے کر جائیں۔ آپ کو خواہ اِس کا شعور ہو یا نہ ہو، اور آپ خواہ اِس بات کا کوئی پاس کریں یا نہ کریں، جب تک آپ مسلمان ہیں وہ سب لوگ آپ کو اسلام کا نمائندہ ہی سمجھیں گے جن کے ساتھ آپ کو رہنے سہنے، ملنے جُلنے اور کام کرنے کا موقع ملے گا۔ وہ آپ کی ایک ایک چیز سے اندازہ لگائیں گے کہ جس دین و ملت

کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں وہ کیا ہے۔ آپ کی ہر کمزوری اُن کی نگاہ میں اُس دین و ملت کی کمزوری قرار پائے گی اور ہر خوبی آخرکار اُس کی خوبی ٹھیرے گی۔ اس لیے ہر مسلمان کو جو یہاں رہتا ہے یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ یہاں وہ محض اپنی پرائیویٹ حیثیت میں مقیم ہے اور اُس کی بھلائی اور بُرائی اس کی ذاتی بھلائی اور بُرائی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ نہیں، وہ فی الواقع یہاں اسلام اور ملتِ مُسلمہ کا سفیر ہے۔ یہ سفارت کی ذمہ داری مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ سے آپ اُس پر عائد ہوتی ہے، اِس سے وہ سبکدوش ہونا چاہے بھی تو نہیں ہو سکتا۔

اِس منصبِ سفارت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے جو کچھ آپ کو کرنا چاہیے اس کو مَیں بڑے اختصار کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں

اوّلین چیز یہ ہے کہ آپ کے ہر فرد میں اپنے سفیرِ اسلام ہونے کا شعُور رہو۔ یہ شعور جس لمحہ کسی شخص میں پیدا ہو گا اُسی لمحہ سے وہ اپنی زندگی، اپنے اخلاق، اپنے معاملات اور اپنے برتاؤ کو اِس نگاہ سے دیکھنا شروع کر دے گا کہ یہ محض میرا ذاتی کردار نہیں ہے بلکہ میرے دین اور میری ملت کی نمائندگی بھی ہے، اور یہی چیز اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ کیا میں اُس کی ٹھیک نمائندگی کر رہا ہوں ؟ کیا مجھے دیکھ کر ایک آدمی واقعی یہ محسوس کرے گا کہ اسلام کوئی قابلِ غور چیز ہے، مسلمان اپنی کوئی امتیازی شان رکھتا ہے، اور اُس چیز کا پتہ لگانے کی ضرورت ہے جس نے اِس میں یہ امتیازی شان پیدا کی ہے ؟

یہ شعُور اپنے اندر بیدار کرنے کے بعد آپ کو یہ سمجھنا ہو گا کہ ایک غیر مسلم معاشرے میں بکھرے ہوئے وہ چند افراد جو یہاں اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں، کس طرح اپنی امتیازی شان نمایاں کر سکتے ہیں جس سے اِس معاشرے کے لوگوں کو اُن کا اور اپنا فرق محسوس ہو، اور وہ فرق بھی ایسا ہو جو اُن میں قدر کا احساس پیدا کرے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ جتنا زیادہ آپ اپنے آپ کو اِس معاشرے کا ہم رنگ بنائیں گے اتنی ہی زیادہ آپ کی امتیازی حیثیت مٹے گی اور اسی قدر زیادہ آپ ناقابلِ توجہ ہو جائیں گے۔ کچھ زیادہ مدت ابھی نہیں گزری ہے، ۲۰ سال پہلے ہی کی بات ہے کہ یہی انگریز آپ

کے اپنے ملک میں رہتے تھے، اور ڈھائی سو برس انہوں نے وہاں گزارے۔ اس پورے زمانے میں کس چیز نے ان کا امتیاز قائم کیے رکھا؟ انہوں نے کبھی آپ کا لباس نہیں پہنا۔ کبھی آپ کی زبان نہیں بولی۔ کبھی آپ کے کھانے نہیں کھائے۔ کبھی آپ کے طرزِ زندگی کو اختیار نہیں کیا۔ کبھی اپنے طور طریقے آپ کی خاطر نہیں چھوڑے۔ جن طریقوں کو بھی یہ اپنے اصول اور معیاروں کے مطابق ٹھیک سمجھتے تھے اُنہی پر عمل کرتے رہے۔ آپ مدتوں ان کی ایک ایک چیز پر ناک بھوں چڑھاتے رہے۔ مگر ان کی اسی استقامت اور قومی کیرکٹر کی مضبوطی نے آخر کار ان کو بدلنے کے بجائے آپ کو بدل ڈالا۔ اس کے برعکس اگر یہ آپ کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیتے تو ہندوستان کے سمندر میں مٹھی بھر انگریز نمک کی طرح گھل کر رہ جاتے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ طاقت ور دوسروں کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے، اور کمزور خود دوسروں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے آپ سے خود شرماتے ہوں اور دوسروں کے معاشرے میں جاتے ہی اپنا لباس، اپنی زبان، اپنی معاشرت، اور اپنی زندگی کے اصول اور طور طریقے چھوڑ چھاڑ کر اپنے آپ کو اُن کا ہم رنگ و ہم مشرب بنا لیتے ہوں، اُن کو دیکھتے ہی اُس معاشرے کے افراد لازماً یہ اثر لیتے ہیں کہ یہ کمزور مزاج کے لوگ ہیں، اپنے آپ کو خود کمتر اور ہمیں برتر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کوئی اثر وہ کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ اور کیوں اُن کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہو کہ ان بے چاروں کے پاس بھی کوئی چیز قدر کے لائق ہو سکتی ہے؟

پس اگر آپ یہاں اسلام کے سفیر ہونے کا حق ادا کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے آپ کو ایک مضبوط کیرکٹر رکھنے والا گروہ بنائیے۔ اپنے لباس، اپنی زبان، اپنے طرزِ زندگی، اور اپنے اخلاق و معاملات میں اپنی امتیازی شان قائم کیجیے۔ جو فرائض مسلمان پر اُس کا دین عائد کرتا ہے اُن کو علانیہ ادا کیجیے اور ہر اس مزاحمت کا مضبوطی کے ساتھ مقابلہ کیجیے جو اُن کے ادا کرنے میں پیش آئے۔ جن چیزوں کو اسلام حرام قرار دیتا ہے، سخت تکلیف اٹھا کر بھی اُن سے پرہیز کیجیے اور اُن کو حرام کہتے ہوئے نہ شرمائیے۔ آپ کی معاشرت کے لیے جو طریقے اسلام نے بتائے ہیں اُن کو پوری جرأت کے ساتھ برتیے اور جب یہاں کی معاشرت سے آپ کی معاشرت کے طریقوں کا فرق ظاہر

ہونے پر اعتراضات ہوں تو گھبرا کر اپنے آپ کو نہ بدلیے بلکہ دھڑلے کے ساتھ اپنے طریقوں کی برتری ثابت کیجیے۔ اپنے اخلاق اور معاملات میں وہ پاکیزگی، وہ راستبازی اور وہ دیانت پیدا کیجیے جو آپ کے گرد و پیش رہنے والے ہر شخص کو نمایاں طور پر محسوس ہو اور بالآخر یہاں کے لوگوں میں یہ عام رائے پیدا ہو جائے کہ مسلمان ایک خاص ٹائپ کا آدمی ہوتا ہے جس سے فلاں اوصاف کی توقع کی جا سکتی ہے اور فلاں اوصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

یہ ڈھنگ آپ اختیار کریں گے تو آپ کے لیے اسلام کی نمائندگی کرنے کے راستے خود بخود کھلتے چلے جائیں گے، اور اس سے دُہرا فائدہ ہو گا۔ یہ فائدہ بھی ہو گا کہ آپ کی اس روش سے یہاں کے عام لوگوں میں ہر طرف کچھ سوالات پیدا ہوں گے جن کا جواب آپ سے مانگا جائے گا۔ اور یہ فائدہ بھی ہو گا کہ آپ اِن سوالات کا جواب دینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے پر خود مجبور ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر نماز روزے کی پابندی پر آپ کا ہر حال میں اور ہر جگہ اصرار ان عبادات کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں ایک عام سوال پیدا کر دے گا، اور اُس کو سمجھانے کے لیے آپ کو خود اُسے سمجھنے اور بیان کرنے کے قابل بننا پڑے گا۔ حرام و حلال کی تمیز میں آپ کی شدت جگہ جگہ یہ سوال اٹھا دے گی کہ یہ تمیز کیسی اور کیوں ہے، اور اُس کا جواب دینے کی قابلیت آپ کو اپنے اندر پیدا کرنی پڑے گی۔ یہاں کی مادر پدر آزادی سے آپ بچیں گے، مخلوط معاشرت اور اس کی تمام گندگیوں سے آپ اجتناب کریں گے، اور آپ کی خواتین پردے کے حدود کی پابندی کریں گی تو بڑے پیمانہ پر یہ سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے کہ مغربی معاشرت کی "ترقی پسندی" کے مقابلے میں یہ "رجعت" کیسی ہے۔ اُس وقت آپ کے لیے یہ بتلانے کا بہترین موقع ہو گا کہ جس "ترقی پسندی" پر یہ لوگ ناز کر رہے ہیں اس میں کیا قباحتیں ہیں، اس کے کیا نتائج رونما ہو رہے ہیں، اور جسے یہ "رجعت" سمجھ رہے ہیں وہ کن وجوہ سے انسانی معاشرے کے لیے ایک بہتر اور پاکیزہ تر راستہ ہے۔ آپ شاید یہ خیال کریں گے کہ اِن سوالات کا چھڑنا اور اِن پر بحثیں ہونا بس خواہ مخواہ کی قیل و قال بن کر رہ جائے گا اور اس کا کوئی اثر یہاں کے معاشرے پر نہ پڑے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نتیجہ اِس کے بالکل برعکس

ہوگا۔ انسانی معاشرہ کبھی اور کہیں ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوتا جو غلط طریقوں کے عام رواج کو اُن کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں سمجھتے اور اُن کے نقصانات کو خود کم و بیش محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اِس برطانوی معاشرے میں بھی کمی نہیں ہے۔ آپ اپنے بہتر نظامِ زندگی کے اتباع میں مضبوطی دکھائیے اور اپنے عمل اور اپنی زبان سے اُس کی نمائندگی کیجیے۔ کچھ زیادہ دن نہ گزریں گے کہ اسی معاشرے میں جسے آپ اِس بگاڑ پر مگن پا رہے ہیں، ہزاروں مرد، عورتیں، جوان اور بوڑھے ایسے نکل آئیں گے جو سنجیدگی کے ساتھ آپ کی باتوں پر غور کرنا شروع کر دیں گے۔ اور روز بروز اُن لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی جو غور کرنے سے آگے بڑھ کر اُن کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔ آپ ہمت کرکے اِس کا تجربہ کیجیے۔ انشاء اللہ دیر یا سویر یہ اپنا رنگ دکھا کر رہے گی۔

لیکن دنیا کے اس انتہائی ترقی یافتہ ملک میں اسلام کی نمائندگی کرنے کے لیے صرف یہی چیز کافی نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ اور سائنس اور معاشرتی علوم اپنے عروج پر ہیں۔ یہاں اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور علم رکھنے والے لوگ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں مضبوط دلائل، وزنی تنقید، زبردست علمی شواہد، اور شاندار طرزِ پیش کش کے بغیر کوئی چیز فروغ نہیں پا سکتی۔ اس لیے ہمارے لائق اور ذہین نوجوانوں میں سے کم از کم ایک تعداد ایسی ہونی چاہیے جو اپنے آپ کو اُونچے درجے کے علمی کام کے لیے تیار کریں۔ اسلامی نظریۂ حیات کو اچھی طرح سمجھیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں اس کی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔ مغربی علوم اور نظریات سے اس کا مقابلہ کرکے دونوں کا فرق ٹھیک ٹھیک معلوم کریں۔ موجودہ دَور کے مسائل حیات پر اسلامی نظریات کو منطبق کرنے کی زیادہ سے زیادہ معقول اور ممکن صورتیں دریافت کریں۔ اور اپنے آپ کو تحریر و تقریر کے ذریعہ سے عمدہ اظہار و بیان کے قابل بنائیں۔ اس کام کی ضرورت کا احساس ہمارے اندر موجود ہو تو برطانیہ میں اس کے لیے وسائل کی کمی نہیں ہے۔ یہاں اس کے لیے تیاری بھی خوب کی جا سکتی ہے، اور خیالات کی اشاعت کے لیے پریس اور پلیٹ فارم کے وافر ذرائع بھی مل سکتے ہیں۔ کمی جو کچھ بھی ہے ہماری اپنی توجہ، کوشش

اور باہمی تعاون کی ہے، جسے پُورا کرنا ہمارا اپنا ہی کام ہے۔ یہ کسر کوئی دوسرا پُوری نہیں کر سکتا۔

آخری بات مجھے آپ سے یہ عرض کرنی ہے کہ برطانیہ میں مُسلم معاشرے کی ہیئت ایسی ہونی چاہیے جو نومسلم انگریزوں، اور باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو ملا کر ایک وحدت بنا دے، اور اُس وحدت میں شامل ہونے والے افراد کو ذہنی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنے کی پُوری سہولتیں بہم پہنچائے۔ مغربی ممالک میں اسلام قبول کرنے والوں کو بالعموم کوئی ایسا اسلامی معاشرہ نہیں ملتا جس سے منسلک ہو کر وہ پُوری طرح اسلام کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ اس لیے دینِ حق قبول کر لینے کے بعد بھی ان کی زندگی نیم اسلامی اور نیم غیر اسلامی بنی رہتی ہے۔ یہ صورتِ حال کم از کم برطانیہ میں تو ختم ہو جانی چاہیے، کیونکہ خدا کے فضل سے اب وہاں مسلمان ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں، اور ایک مستقل اسلامی معاشرہ وہاں بن سکتا ہے۔

حضرات، یہ چند مشورے ہیں جو اختصار کے ساتھ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ مجھے خود آپ کے درمیان بیٹھ کر حالات کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دے۔ سرِدست جو کچھ دُور سے حالات کا اندازہ مَیں کر سکا ہوں، اس کے لحاظ سے یہ مشورے مَیں نے پیش کر دیئے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ آپ کے لیے مفید ثابت ہوں اور وہاں اسلام کی خدمت کرنے میں آپ کو ان سے کچھ مدد ملے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ترجمان القرآن کے پُرانے پرچے

جلد ۳۱ عدد ۱-۵-۶ - جلد ۴۵ عدد ۲ - جلد ۴۶ عدد ۶

اگر یہ پرچے کسی صاحب کے پاس ہوں تو براہِ کرم مندرجۂ ذیل پتہ پر قیمتاً عنایت فرما کر مشکور فرما دیں۔

محمد صدیق، کاتبِ ترجمان القرآن۔ طارق سٹریٹ۔ چاہ میراں خورد، لاہور

افریقیہ میں اسلام کا ماضی

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۲)

ہَوسا اقتدار: ہوسا قوم شمالی نائیجیریا میں بستی تھی اور خاص طور سکوتو، کانو، زاریا، پاؤچی کے شہر اس کا مسکن تھے۔ ہَوسا قبائل نیگرو روایات سے متاثر تھے۔ ہوسا زبان پورے مغربی افریقیہ میں بولی جاتی تھی (اور آج تک بولی جاتی ہے اور یہی زبان وہاں کی LINGUA FRANCA ہے) اس قوم کی سات ریاستیں تھیں: کانو، رانو، زاریا، دُورا، گوبیر، کٹسینا (موجودہ کادونا)، زمفارا۔ ابتدا میں یہ قبائل ارواح پرست تھے۔ مگر تیرھویں صدی میں جب اسلامی دعوت سے روشناس ہوئے تو بڑی سرعت کے ساتھ انہوں نے اسلام کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ اسلام نے ان قبائل کی معاشرتی اور مذہبی زندگی پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ ان قبائل کے اندر خالص اسلامی تعلیمات پر مشتمل نظام حکومت قائم ہوا۔ اسی طرح انہوں نے اسلامی شریعت کی بنیادوں پر نہایت کامیاب اور دقیق ترین مالی اور عدالتی نظام مدون کیا اور اُسے نافذ کیا۔ مذکورہ ریاستوں کا سربراہ بادشاہ یا امیر ہوتا تھا جس کی معاونت کے لیے وزراء کی مجلس تھی۔ ہر ریاست کا نام اُس کے بڑے شہر کے نام سے منسوب تھا۔ ان ریاستوں کے تمام بڑے بڑے شہروں کے اردگرد دفاعی فصیلیں بنی ہوئی تھیں اور خندقیں کھُدی ہوتی تھیں۔ قبائل کی آبادیاں جب کسی خطرے سے دوچار ہوتی تھیں تو ان شہروں میں آکر پناہ لیتی تھیں۔ یہ ریاستیں خود مختار تھیں۔ ان کے مابین ایک قسم کا فوجی معاہدہ تھا۔ نائیجیریا کے وسطی علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا سہرا زاریا ریاست کے سر ہے اور مشرق میں بُرنو (چاڈ) میں اسلامی دعوت کا کام کانو کی ریاست نے کیا۔ یہ ریاستیں اپنے عہد میں نہ صرف اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کو فروغ دیتی رہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی

امن و اطمینان سے بہرہ ور رہیں کیونکہ ہوسا قوم فطرتاً تجارت پسند تھی اور تجارت اُس کا پیشہ تھا۔ اس لیے وہ دشمن تک سے پُرامن تعاون کو ترجیح دیتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں اُن علاقوں میں اسلامی دعوت کمزور ہوگئی۔ مگر کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے فولانی قبائل کے اندر عثمان دان فودیہ کی شخصیت پیدا کر دی جس نے اسلام کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔

فولانی اقتدار: فولانی قبائل کی اصل کے بارے میں مؤرخین نے اختلاف کیا ہے لیکن اس امر پر تقریباً تمام متفق ہیں کہ یہ قبائل مصر کے بالائی حصے سے آئے اور بحرِ اطلانٹک تک پھیل گئے۔ بعض شمالی نائیجیریا کے علاقے میں آباد ہوگئے اور بعض سینی گال تک پہنچ گئے۔ ان میں سے جو شہری آبادیوں میں بسے وہ ہوسا قبائل کے ساتھ میل جول اور شادی بیاہ کی وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ ان قبائل کو FULANIC GIDDA کہا جاتا ہے، یعنی مخلوط فولانی۔ اور جو قبائل صحرا میں اترے اور ہوسا قبائل سے نہ ملے، وہ نسب میں رہے مگر اسلام کی روشنی سے بہرہ ور نہ ہوسکے۔ ان کو "کادہ فولانی" کہتے ہیں، یعنی فولانی چرواہے۔ ہوسا قوم نے جب اسلام کی اشاعت میں غفلت برتی تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری قوم یعنی مخلوط فولانی قوم کو اس کام کے لیے کھڑا کر دیا۔

فرانسس مور نے ۱۷۳۰ء میں فولانی قبائل کے مسکن، دریائے گامبیا کے کنارے دیکھے ہیں۔ اس کا بیان ہے: یہ قبائل دریا کے کنارے پھیلے ہوتے ہیں۔ عربوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اکثریت عربی زبان بولتی ہے کیونکہ مدارس میں عربی پڑھائی جاتی ہے۔ ان میں ایک عوامی زبان بھی رائج ہے جسے فولی کہتے ہیں۔ ان کو جب کوئی حکمران ستاتا ہے تو یہ اپنے شہر منہدم کر کے دوسرے علاقوں کا رُخ کر لیتے ہیں۔ ان کے اپنے سردار ہیں جو ان پر عدل و انصاف سے حکومت کرتے ہیں۔ فولانی بڑے چست و چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ اقتصادیات میں ترقی یافتہ ہیں۔ گندم اور روئی کی کاشت کرتے ہیں جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اُسے نہایت مناسب داموں بیچ دیتے ہیں۔ سخاوت میں مشہور ہیں۔ جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی جماعت کا کوئی فرد غلام بنا لیا گیا ہے تو سب مجتمع ہو کر اُسے آزاد کرواتے ہیں۔ فولانی قبائل کے پاس گندم وافر ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو تنگ حال نہیں رہنے دیتے۔ سن رسیدہ

اندھے اور اپاہج کی خصوصی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کے اور تندرست نوجوانوں کے درمیان پوری مساوات رکھتے ہیں۔ ان میں کبھی کوئی غضبناک نہیں ہوتا اور نہ کسی دوسرے سے دشنام طرازی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ شجاعت اور استعمال اسلحہ کی مہارت میں ان کی شہرت ہے۔ تیراندازی اور نیزہ بازی کے فن میں یکتا ہیں۔ بعض اوقات بندوقوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ خالص اور پکے مسلمان ہیں۔ شراب نوشی یا کسی اور نشہ آور چیز کا ارتکاب نہیں کرتے[1]

یوربا دور انیسویں صدی کے نصف اول میں جب یورپی اقوام بلاد نائیجیریا کے اندرونی حصوں کی تلاش کر رہی تھیں تو اس وقت نائیجیریا کی کھلی آبادیوں میں نیگرو اقوام یا مراکشی الاصل قبائل آباد تھے جو مسلمان تھے اور طاقتور متمدن ریاستوں کے بانی تھے۔ ان قبائل میں سے جنوبی نائیجیریا کی یوربا (YORBA) قوم ہے۔ ان قبائل کی اصل کے بارے میں متعدد اقوال ملتے ہیں، مگر یہ چیز متفق علیہ ہے کہ یہ خالص نیگرو نہیں ہیں بلکہ مخلوط النسل ہیں۔ اور یہ دعویٰ بھی درست ہے کہ سوڈان کے تمام قبائل اسی قوم کی شاخیں ہیں۔ یوربا مملکت مشرق میں دریائے نیجر کے دہانے سے لے کر مغرب میں داھومی تک محیط تھی۔ اسلام کی شعاعیں شمالی جانب سے فولانی مسلمانوں کے ذریعہ اس قوم تک پہنچیں۔ یوربا کے ایک حکمران افونگا نے ایک ایسے فقیہ کی تلاش میں آدمی بھیجے جو حکومت میں اُس کا مشیر ہو۔ یہ خبر سُنتے ہی ہوسا قبائل کے متعدد علماء و فقہا جنوبی نائیجیریا پہنچنے لگے۔ افونگا نے ان علماء کو فوج میں اقتدار بخشا اور فتوحات میں ان سے مدد لی۔ ان کے ذریعہ سے فولانی قبائل کو یوربا قبائل میں نفوذ حاصل ہوا اور اسلام کو فروغ نصیب ہوا۔

انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ کا دخل شروع ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں یوربا کی تمام ریاستیں لاگوس کے گورنر کے تحت ہوگئیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہوسا قبائل نے جنوبی نائیجیریا کے بُت پرست قبائل کے اندر دوبارہ دعوتِ اسلامی کی اشاعت کی۔ برطانوی استیلاء سے پہلے یوربا کی شہری آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ فولانی قبائل جب اپنی زراعتی سرگرمیوں کی وجہ سے دیہاتوں میں بھی آباد ہونے لگے تو دیہی آبادیوں میں بھی اسلام کا فروغ شروع ہوگیا۔ جنوبی نائیجیریا کی ایجیبو ریاست ۱۸۹۳ء میں اسلام میں

---

[1] FRANCES MOORE, TRAVELS IN THE INLAAD PART, OF AFRICA PP 75-77

داخل ہوگئی۔ سرتھامس آرنلڈ نے ایک سیاح کی رپورٹ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سیاح نے مملکت ایجبیو کے ایک قصبہ کے اندر بیس مسجدیں دیکھیں، اور ایک دوسرے قصبہ میں دس۔ اسلام ان اقوام میں برق رفتاری کے ساتھ پھیل گیا۔ خاص طور پر دریائے نیجر کے جنوبی کنارے کی آبادیاں خالص اسلامی آبادیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ یہاں تک کہ اِدَہ (EDDAH) کے زیریں حصّوں میں ایک بھی بستی بُت پرستوں کی باقی نہ رہی۔ اِدَہ دریائے نیجر کے کنارے ایک شہر ہے اور شمالی نائیجیریا کی جنوبی حُدود سے ملتا ہے[۱]۔

مملکت بُرنو | برنو، ہوسا کے مشرق میں تھا۔ برنو کا سب سے بڑا قبیلہ کانوری تھا جس کی تعداد ۱۵ لاکھ تھی۔ یہ قبیلہ عرب اور نیگرو خون سے مخلوط تھا۔ برنو کانم امپائر کا ایک صوبہ تھی۔ مملکت بُرنو کے پاس بڑی منظم فوج تھی جس میں ترکی بندوقیں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ پُوری مملکت مسلمان تھی۔ ۱۸۰۸ء میں فولانی سردار عثمان دان فودیو نے اس مملکت پر چڑھائی کی۔ مگر محمد الکانمی نامی نے اسے شکست دی۔ محمد الکانمی خود ایک عالم تھا۔ ۱۹۰۰ء میں جب فرانسیسیوں نے بُرنو میں قدم رکھا تو اُس وقت ایک مصری گورنر "العبد رابح" حکومت کر رہا تھا۔ ہوسا کی طرح مملکتِ برنو میں بھی اسلامی احکام کی عملداری تھی۔ اگرچہ بعض نئے ٹیکس بھی جاری کیے گئے تھے مثلاً "ہاکو بنیرام ٹیکس" (یعنی انکم ٹیکس)، مگر اسلامی شریعت کے نفاذ کا پُورا پُورا اہتمام کیا گیا۔

مملکت کانم | یہ بحیرہ چاڈ کے شمال مشرق میں تھی۔ مملکت کانم میں اسلام مصر کے راستے سے پہنچا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں جب یہاں کے لوگ مسلمان ہوگئے تو مملکت کانم ایک زبردست اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اور اس کے اقتدار کے ڈانڈے مصر اور نوبہ کی سرحدوں تک تمام مشرقی سوڈان کے قبائل سے مل گئے۔ کانم کا سب سے پہلا مسلمان حکمران گیارھویں صدی کے اواخر یا بارھویں صدی عیسوی کے نصف میں گزرا ہے۔ اندلس کا نامور جغرافیہ دان ابوعبیداللہ البکری گیارھویں صدی میں موجود تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ یہ مملکت اُس کے عہد میں مغرب میں دریائے نیجر تک تھی۔ ہوسا کے کچھ حصّے بھی

[۱] الدعوۃ الی الاسلام (عربی ترجمہ پریچنگ آف اسلام)، ص ۲۰۵-۲۰۶

اس میں شامل تھے۔ اہلِ کانم تونس کی حفصی حکومت سے بھی مدد لیتے رہے ہیں۔ بارھویں صدی کے اختتام تک اہل کانم نے تمام صحراء کو فتح کر لیا تھا۔ ۱۲۵۷ء میں کانم نے تونس میں اپنی سفارت قائم کی۔ اگلی صدی میں اس کی طاقت دوگنی ہوگئی۔ چودھویں صدی میں یہ مملکت ضعف کا شکار ہوگئی۔ عمر بن ادریس سلطان کانم نے مجبوراً دارالحکومت بحیرۂ چاڈ کے مغرب میں منتقل کر دیا اور بلاد برنو میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد مملکت کانم کا نام مملکت برنو مشہور ہوگیا۔

قلقشندی نے لکھا ہے :

اہلِ کانم کی جنسِ تبادلہ "دندی" نام کا ایک کپڑا ہے جو ان کے ملک میں تیار ہوتا ہے۔ اس کے ایک ٹکڑے کا طول دس گز ہوتا ہے۔ ریشم، تانبا اور کاغذ کی بھی تجارت کرتے ہیں مگر ان چیزوں کا نرخ "دندی" میں لگاتے ہیں۔ کانمی امام مالک کے مذہب کے پیرو ہیں۔ مالکی مذہب کی عظیم الشان تعلیم گاہ قائم کر رکھی ہے جو دراصل اسلامی تعلیم و تربیت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ کانمی فوج منہ کو ڈھانک کر رکھتی ہے۔ اور جذبۂ جہاد اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے[1]۔"

نیگرو اقوام پر اسلام کے اثرات مذکورہ بالا مملکتوں میں دو طرح کی نسلوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک وہ نسل جو شمالی افریقہ سے آکر ان علاقوں میں آباد ہوتی ہے، وہ سفید نسل کہلاتی ہے۔ دوسری وہ جو اصل آبادی ہے اور سودانی (نیگرو) نسل کہلاتی ہے۔ یہ سیاہ فام نسل ہے۔ اسلام نے نیگرو نسل کی اجتماعی زندگی پر بڑے دُور رس اثرات ڈالے۔ اسلام کی نظر میں رنگ اور نسل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ پر اخوت، مساوات اور اسلامی تہذیب کی حکمرانی ہوتی ہے۔ ان مقدس اصولوں نے نیگرو اقوام کو اپنی قدیم روایات اور وحشیانہ عادات کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور تہذیب کے میدان میں انہیں ذہنی، اخلاقی اور مادی لحاظ سے وہی ترقی نصیب ہوئی جو عربی اور دوسری سفید فام اقوام کو ہوئی۔ بوسورتھ اسمتھ نے اس حقیقت کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے :

"نیگرو اقوام میں اسلام کی اشاعت کے بعد، ان کی قبیح ترین عادات، مثلاً آدم خوری، انسانی

[1] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۲۸۰ - ۲۸۱

قربانی، اولاد کو زندہ درگور کرنا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یکایک محو ہوگئیں۔ نیگرو باشندے جو اسلام سے پہلے برہنہ یا نیم برہنہ زندگی بسر کرتے تھے لباس کا استعمال سیکھ گئے۔ بلکہ لباس میں بھی نفاست اور عمدگی کا معیار بلند کردیا۔ جو نیگرو باشندے زندگی بھر نہ نہاتے تھے، انہوں نے نہانا شروع کردیا بلکہ کثرت سے نہانے لگے۔ کیونکہ اسلامی شریعت طہارت اور پاکیزگی کی تاکید کرتی ہے۔ یہ لوگ اب کسی معقول وجہ کے بغیر لڑتے جھگڑتے نہ تھے۔ لوٹ کھسوٹ اور چوری بھی شاذ و نادر رہ گئی۔ لوگوں کے جان و مال محفوظ ہوگئے۔ ان میں تعلیمی ادارے قائم ہوگئے۔ اگر ان تعلیمی اداروں میں صرف ناظرہ قرآن ہی پڑھایا جاتا تو بھی ان مدارس کا بڑا کارنامہ ہوتا۔ مگر اس سے بڑھ کر ان میں علوم کو ترقی نصیب ہوتی۔ نیگرو بستیوں میں کریہ المنظر بت خانوں کے بجائے مسجدیں بستیوں کا مرکز قرار پاگئیں جو نہایت صاف ستھری اور مزین و مستحکم ہوتی تھیں۔ ان میں پانچ مرتبہ اذان ہوتی، تمام لوگ قبلہ رُخ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، ان کا انتظام امام اور خطیب کے ہاتھ میں تھا۔ نیگرو باشندوں کو پہلے جن چیزوں کی پرستش کی تلقین کی جاتی تھی اُس کی جگہ اب اُن پر ایسے خدا کی عبادت کا ذوق چھا گیا جو واحد ہے، قہار ہے، ہر جگہ موجود ہے، دانا و بینا ہے، رحیم و مہربان ہے۔ ان کی صنعتوں نے ترقی کی۔ ان کی تجارتیں چمکیں۔ اور تجارت بھی گونگے مبادلۂ اجناس (DUMBBARTER) کی شکل میں نہ رہی، نہ خام اجناس کے تبادلہ کا وہ طریقہ رہا جو ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق افریقہ کے قدیم ترین ادوار میں پایا جاتا تھا۔ ان کی صنعتیں مہارت و فن کا بے مثال نمونہ تھیں۔ ان کی تجارت منظم اور پائیدار اصولوں پر قائم تھی۔ نہایت پُرامن اور ترقی یافتہ سوسائٹیاں نیگرو آبادیوں میں وجود میں آگئیں۔ یہ اُس نظام صنعت و تجارت اور اُس نظام حکومت کی بدولت ہُوا جو اسلام لے کر آیا تھا۔ . . . . جہاں تک ان کی انفرادی زندگی کا تعلق ہے، اسلام نو مسلم زنگیوں میں جدوجہد، خودداری، خود اعتمادی اور احترام ذات کی رُوح پھونک دیتا ہے۔ یہ خوبیاں ہمیں اُن کے بُت پرست اور مسیحی ہم وطنوں میں نظر نہیں آتیں[1]۔"

اسلامی معاشرے کے اندر افریقی مسلمان کے احساسات اور دین کے ساتھ اُس کے تعلق و اطمینان کو موریل نے اپنی کتاب "نائیجیریا کے باشندے اور مسائل" میں ان الفاظ میں لکھا ہے:

۱؎ BOSWORTH SMITH: THE NINTEENTH CENTURY

"اہل نائیجیریا کے نقطۂ نظر سے اسلام کسی سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ دخولِ اسلام کے ساتھ ساتھ اپنی قومیت سے ہاتھ دھولیں۔ نہ وہ اجتماعی زندگی میں فوق الفطرت تبدیلی کو لازم ٹھیراتا ہے۔ اور نہ وہ خاندان یا اجتماع کے اقتدار کا قصر مسمار کرتا ہے۔ اسلام کے مبلغ اور نومسلم کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوتی۔ وہ ہم رتبہ ہیں۔ انسانی اخوت کا اصول اسلامی سوسائٹی میں عملاً نافذ کیا جاتا ہے۔ اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے ذاتی حالات، اپنے خاندان کے معاملات اور اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل سے دست کش ہوجائے۔ نہ اسلام ملک کے اصل حکمرانوں کے احترام کے منافی ہے۔ ایسا کوئی شخص نہ ملے گا جو نائیجیرین مسلم کے رویّہ سے بلکہ پُورے افریقیہ کے مسلمانوں کے رویّہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ افریقی مسلمان کی ظاہری ہیئت ہی یہ غمازی کرتی ہے کہ اُسے اپنی قومیت کا شعور ہے اور اپنی نسل پر فخر ہے۔ آپ سے افریقی مسلمان زبانِ حال سے یہ کہے گا کہ کیا ہُوا کہ ہماری زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے، بشر ہونے میں تو ہم سب برابر ہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو مرتبہ بلند عطا کرتا ہے اور انسانی مرتبہ و مقام کے بارے میں ایسا تصوّر ان کے دماغ میں پیدا کر دیتا ہے جو تمام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ اسلام انہیں ہزاروں خرافات و اوہام سے آزاد کر کے خدائے واحد کے آگے جھکا دیتا ہے"[1]۔

تیسرا دور: انفرادی اصلاحی کوششیں | یہ انفرادی کوششوں کا دور ہے۔ اور ۱۷۵۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۰۱ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں علماء و مشائخ طریقت اور اخوان مجاہدین کی جدوجہد کی بدولت اسلام میں نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب افریقیہ کے علاقوں میں پروٹسٹنٹ مشنری داخل ہوئے اور کیتھولک کلیسا نے بھی اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا تو مسلمان علماء کو اس کی فکر لاحق ہوئی اور انھوں نے اپنی دعوت و تجدید کے نظام کو از سرِ نو قائم کیا۔ اس دور میں کئی مصلحین اٹھے جن میں سے چند یہ ہیں:

عثمان دان فودیو | اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام کے لگ بھگ ریاست گوبیر کی ایک بستی میں ایک نامور فقیہ پیدا ہوئے۔ ان کا نام عثمان دان فودیو تھا اور ان کا تعلق فولانی قبیلے سے تھا۔ ابتدائی

---

[1] موریل ص ۲۱۶ و ۲۱۷

تعلیم اپنے والد محمد فودی اور اپنی والدہ حوا اور اپنی دادی رقیہ سے حاصل کی۔ تفسیر میں ان کے استاد مغربی افریقہ کے عالم شیخ احمد بن محمد زنفری اور حدیث میں الحاج محمد بن راجی تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ایک طرف ان قبائل میں توحید خالص کا تصور محو ہو رہا تھا، جاہل عوام درختوں اور پتھروں کی تعظیم کر رہے تھے اور انہیں حاجت روا سمجھ رہے تھے اور دوسری طرف ظلم و تشدد کا راستہ اختیار کر چکے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی بادشاہ بیمار ہو جاتا تو موت سے بچنے کے لیے غلام یا لونڈی کو ذبح کرتا اور اسے فدیۂ موت قرار دیتا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ عیسائیت تازہ دم ہو کر افریقہ میں داخل ہو رہی تھی۔ پروٹسٹنٹ مشنری گروہ در گروہ میدان میں اُتر رہے تھے۔ کیتھولک چرچ نے بھی اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا تھا۔ عثمان دان فودیو جب حج بیت اللہ کے لیے گئے تو وہاں انہیں محمد بن عبدالوہاب کے متبعین سے ملاقات کا موقع ملا۔ عثمان دان نے ان کی تحریک توحید کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا اور واپس جا کر انہی بنیادوں پر ایک اصلاحی تحریک کی داغ بیل ڈال دی، جس کے پیش نظر صرف عقائد کی اصلاح نہ تھی بلکہ جہاد کے ذریعہ اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا سدباب بھی تھا۔ عثمان دان بڑے متقی اور خدا ترس انسان تھے۔ ان کے وعظ و ارشاد کے نتیجہ میں خلق کثیر ان کے ہاتھ پر تائب ہوئی۔ اور ان کی دعوت کے حامیوں کا وسیع حلقہ وجود میں آگیا۔ انہوں نے اپنے اخلاقی اثر کی بدولت ہوسا کے متفرق اور پراگندہ قبائل کو منظم کیا اور انہیں ایک مضبوط جماعت کی شکل دے دی۔ ۱۸۰۲ء میں گوبیر کے بُت پرست بادشاہ یاؤ نے گوبیر کی حدود میں عثمان دان کی دعوت کو پھیلتے دیکھ کر اس سے تعرض کیا اور اپنی رعایا کے بعض مسلمان باشندوں پر مظالم توڑنے شروع کر دیئے۔ عثمان دان نے اُسے مسلمانوں کو ستانے کی پالیسی سے باز رہنے کا پیغام بھیجا۔ مگر وہ اور غضبناک ہو گیا اور عثمان دان کو دربار میں طلب کیا۔ عثمان دان کے متبعین یہ سنتے ہی گوشے گوشے سے ان کے پاس جمع ہو گئے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی، انہیں "امیر المسلمین" (SARKIN MUSULMAIN) کا لقب دیا، اور بُت پرست اقتدار کو ختم کرنے اور اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کی اُن سے درخواست کی۔ عثمان دان

نے جہاد کا اعلان کر دیا اور مجاہدین کی جماعت کو ہم دستوں میں منظم کر کے ان کو نصیحت کی کہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں لڑیں۔ عثمان دان نے سکوتو شہر کی بنا ڈالی اور اُسے اپنا مستقل مرکز بنایا اور وہیں سے فتوحات کی تنظیم کی۔ یہ شہر اب بھی شمالی نائیجیریا کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

عثمان دان فودیو کا جہاد صرف بُت پرستوں کے خلاف ہی نہ تھا بلکہ اُن مسلمانوں کے خلاف بھی تھا جن کے ہاتھوں دین محض کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے تحریک جہاد و قتال کے ساتھ مسلمانوں کی آبادیوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی زبردست مہم جاری کی۔ یہ مہم بڑی حکمت و تدبر پر مبنی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس کے خوش کُن نتائج برآمد ہونے شروع ہوگئے۔ دس سال کے اندر اندر ہوسا کی تمام مسلمان مملکتیں کانو، کشنہ، دورہ، زاریا، ازین اور کبی کی سلطنتیں عثمان دان کی تحریک جہاد و اصلاح کے زیر اثر آگئیں۔ ان کے اندر ایک عظیم الشان اسلامی حکومت وجود میں آگئی۔ عثمان دان نے مذکورہ حکومت کی تنظیم کا کام اپنے بھائی عبداللہ اور اپنے بیٹے محمد بیلو کے سپرد کر دیا اور خود دین کی تعلیم اور دعوت و تربیت کے کاموں میں مشغول رہے۔ ۱۸۱۷ء میں ان کی وفات ہوئی سکوتو میں ان کی قبر موجود ہے۔ عثمان دان کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے محمد بیلو کو خلافت کی مسند پر بٹھایا گیا۔

سلطان بیلو کا ابتدائی دور اضطرابات اور فتنوں کا دور تھا کیونکہ بعض قبائل نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ لیکن مجاہدین نے اس شورش کو ختم کر دیا اور انہوں نے سلطان بیلو کی اطاعت میں بھی اسی جذبے کا ثبوت دیا جو عثمان دان فودیو کے حق میں دکھلاتے رہے تھے۔ سلطان محمد بیلو کی سلطنت جو "فولانی ریاست" کہلاتی تھی سات بڑے بڑے صوبوں پر مشتمل تھی۔ یہ وہی صوبے تھے جو ماضی میں ہوسا مملکت کا حصہ رہ چکے تھے۔ انگریز لیفٹیننٹ کلیپرٹن (   ) نے ۱۸۲۴ء میں سلطان محمد بیلو سے ملاقات کی تھی۔ جب یہ انگریز لیفٹیننٹ واپس جانے لگا تو سلطان محمد بیلو نے شاہ برطانیہ کے نام اُسے ایک خط دیا جس میں شاہ برطانیہ کو تلقین کی کہ وہ مسلمان رعایا کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آئے۔ سلطان بیلو کے بعد اُس کا لڑکا ابوبکر عتیق جانشین ہوا اور آج تک سکوتو کی حکومت اُسی

خاندان میں متوارث چلی آ رہی ہے۔ شمالی نائیجیریا کے وزیراعظم احمدو بیلو مرحوم اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

تقریباً ایک صدی تک فولانی سلاطین نے شمالی نائیجیریا پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کی ہے اور بڑی قدرت و قابلیت کے ساتھ مملکت کا نظم و نسق چلایا ہے جس کا اعتراف خود نائیجیریا کے سابق گورنر سرامین برنر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہ سلطنت ایک ایسی ترقی یافتہ حکومت کا نمونہ تھی جو اسلامی نظریہ پر مبنی تھی۔ اس کا نظام مالیات و محاصل انتہائی باریک و منظم تھا۔ اس کی عدلیہ انتہائی تربیت یافتہ اور قابل تھی۔ اس میں اسلامی قانون انتہائی قابلیت، غیرجانبداری اور ایمانداری کے ساتھ نافذ العمل تھا۔

عدلیہ انتظامیہ سے آزاد تھی۔ قضاۃ مالکی مذہب کے مطابق اسلامی شریعت کا نفاذ کرتے تھے۔ حکومت کا نظام قرآن و سنت پر مبنی تھا۔ مسلمان قضاۃ باریک بینی، علمی تبحر اور قانون فہمی میں بڑے نامور تھے۔ ان کے پاس فقہی لٹریچر سے بھری ہوئی الماریاں تھیں۔ حکومت وراثتاً منتقل نہ ہوتی تھی یعنی باپ کے بعد بیٹا از خود جانشین نہیں ہو جاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان ریاستوں کا نظامِ حکومت اسلامی نظریہ کے مطابق شورائی تھا۔ سربراہ کی مدد کے لیے نائب ہوتا تھا جسے ہوسا زبان میں "وزیری" کہا جاتا تھا۔ وزیر خزانہ کو "آگی" اور پولیس کے چیف کو "سارکین دوگاری" کہتے تھے۔[1]

عثمان دان فودیو نے دعوت و اصلاح اور جہاد و قتال کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ مختلف موضوعات پر ان کی تقریباً ۲۰ کتابیں ملتی ہیں۔ بعض موضوعات نہایت اہم ہیں جن کا اندازہ کتابوں کے نام سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً اصول الولایۃ، احیاء السنہ، الجہاد، علوم المعاملۃ المہدی المنتظر، الہجرۃ، نصائح الامۃ، شفاء العلیل، عمدۃ العلماء وغیرہ۔ عثمان دان کے بھائی عبداللہ بن فودی بھی مصلح ہونے کے علاوہ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ علماء کی طرف سے انہیں "نادرۃ الزمان" کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد چار سو کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ مثلاً تفسیر ضیاء التاویل

[1] الاسلام فی نائیجیریا۔ تالیف آدم عبداللہ الوری

ذ قرآن کی تفسیر، ضیاء السیاسۃ، ضیاء الحکام، نیل المرام، سبیل النجاۃ، مصالح الانسان وغیرہ عثمان دان کے صاحبزادے شیخ محمد بیلو نے اپنے والد اور چچا سے اکتساب علم کیا اور تاریخ کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتاب "انفاق المیسور فی تاریخ بلاد التکرور" نہایت اہم کتاب ہے اور مغربی افریقہ کی تاریخی معلومات میں ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ الغرض فودی خاندان نے مغربی افریقہ میں علم وعرفان اور دعوت وارشاد کے باب میں قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اور اسی خاندان کی کتابیں آج مغربی افریقہ کے اسلامی مدارس میں داخل نصاب ہیں۔

بقیہ: ——— مصر اور اخوان

تھی وہ بھی ضائع کر دی۔ اور اب صدر ناصر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مصر، سعودی عرب اور یمن کے مختلف عناصر جن میں سلال کے حامی بھی ہوں اور بدر کے ساتھی بھی، بیٹھ کر اس قضیے کا فیصلہ کریں، خواہ آج، خواہ کل، خواہ براہ راست اور خواہ دوسروں کی وساطت سے۔ آخر اس عظیم غلطی کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ نفسیاتی الجھن بھی مصری فوجوں کے اندر شدید بے چینی پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے۔ اس بے چینی کا حل بھی یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ملک کے اندر خوف وہراس کی فضا پیدا کی جائے اور اگر کہیں زبانِ تنقید یارائے گویائی دکھائے تو اُسے قبل از وقت بند کر دیا جائے۔

سوڈان میں کمیونسٹ عناصر کا جو حشر ہو چکا ہے وہ خاصا عبرت انگیز ہے۔ مصری کمیونسٹوں نے انتہائی کوشش کی کہ سوڈانی کمیونسٹوں کو سہارا دیا جائے۔ جنوبی سوڈان کے باغیوں کو شہ دی تاکہ سوڈان کے داخلی حالات میں افراتفری پیدا کر دی جائے اور مسلمانوں کی توجہ کمیونسٹوں سے ہٹا دی جائے۔ مگر سوڈان کے اخوان المسلمون نے دوسرے تمام اسلام پسند عناصر کے اتحاد سے سوڈان سے کمیونسٹوں کی بیخ کنی کر دی۔ مصری کمیونسٹ اور روس کی کمیونسٹ پارٹی نے اس کا انتقام مصر کے اخوان المسلمون سے لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے نزدیک اخوان خواہ مصری ہوں

یا سوڈانی ، اردنی ہوں یا شامی ، عراقی ہوں یا سعودی ، اخوان ہی ہیں ۔ ایک ہی ان کی دعوت ہے اور ایک ہی ان کا نظام ہے

ان اسباب و وجوہ کی بنا پر اگست ۱۹۶۵ء میں جب صدر ناصر ماسکو کے دورے پر گئے تو وہاں انہوں نے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "اخوان نے میرے قتل کی سازش تیار کی تھی جو طشت از بام ہو چکی ہے ۔ ماضی میں میں نے انہیں معاف کر دیا تھا لیکن اب معاف نہیں کروں گا"۔ اُدھر موصوف نے ماسکو میں اس "سازش" کا انکشاف کیا اور اِدھر مصر میں ہنگامۂ دارو گیر برپا ہو گیا ۔ اخوان پر ہاتھ ڈال کر صدر ناصر نے کئی حلقوں کے لیے سامانِ تسلی فراہم کیا اور بہت سے مختلف مقاصد حاصل کیے ۔ روس کو خوش کیا ، مصری کمیونسٹ پارٹی کو (جو روسی نظریات سے منسلک ہے) خوش کیا ۔ روس کی خوشی کی بدولت امداد میں اضافہ ہوا اور مصری کمیونسٹ پارٹی کا بھی وہ شکوہ دُور ہوا جو اسے ملک کے اندر رجعت پسندانہ افکار کی کھلم کھلا اشاعت سے تھا ۔ امریکہ کو بھی خوش کر دیا ، کیونکہ امریکہ کی نگاہ میں کمیونسٹوں کی سرکوبی سے اسلام پسندوں کی سرکوبی ہزار درجہ افضل و انفع ہے ۔ یہودیوں کو بھی خوشی حاصل ہوئی کہ وہ پارٹی جو اری ٹیریا کے باغی مسلمانوں کی پشت پناہی کرتی ہے اور اُن کے منظورِ نظر حکمران ہیلا سلاسی کے لیے مشکلات کا موجب بنی ہوئی ہے ، سرِ دار لٹک رہی ہے ۔ مصر میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے ایک بنیاد ہاتھ آ گئی تاکہ اگر کسی دوسرے شخص کے دماغ میں "خناس" گھسا ہوا ہے تو وہ اخوان کے انجام سے عبرت حاصل کرے ۔ اور "سوشلزم" کو یا مشدہ مین کو اپنی تنقید کا ہدف نہ بنائے ۔

"سازش" کے انکشاف کے بعد مصری خفیہ پولیس نے جس بیدردی کے ساتھ اخوان کو گرفتار کیا ہے اور اخوان کے گھروں میں گھس کر ان کی خواتین سے تعرض کیا ہے ، قلم اُس کے بیان کا یارا نہیں رکھتا ۔ بعض مثالیں ایسی بھی سامنے آتی ہیں کہ میاں اور بیوی دونوں کو گرفتار کر لیا مگر ان کے معصوم بچے گھر میں لاوارث پڑے ہیں ۔ والدین کا اصرار ہے کہ اُن کے بچوں کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ وہ گھر میں بھوک سے مرنے کے بجائے جیل میں دن گزار لیں ۔ مگر مصری پولیس اُن کی درخواست رد کر دیتی

ہے۔ کوئی اور شہری بھی ان کو اپنی حفاظت میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ محض ان کی حفاظت کی خواہش کا اظہار ہی خود اُسے بھی مشکوک ٹھیرا دے گا۔ اس پکڑ دھکڑ سے مصر کے گوشے گوشے میں ایک قیامت ٹوٹ پڑی اور چونکہ فلاحین میں اخوان کا زیادہ اثر تھا اس لیے یہ غریب قوم مصری پولیس کے انتقام کا نشانۂ خاص بنی۔ بلکہ دو واقعات ایسے رونما ہوئے جنہوں نے حالات کو انتہائی نازک کر دیا۔ ایک کرداسہ کا واقعہ اور دوسرا دمیاط کا حادثہ۔

کرداسہ سمندر کی جانب ایک بستی ہے۔ اس بستی میں خفیہ پولیس کے کچھ افراد اخوان کے کارکنوں کی تلاش میں گئے اور اسی تلاش و جستجو میں وہ ایک گھر میں گھس گئے۔ وہاں جب انہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص بھی اخوان میں سے نہیں ہے تو اس گھر کی ایک خاتون کو انہوں نے گرفتار کر لیا اور اُسے گھسیٹ کر لے آئے۔ بستی کے کسانوں کو اس کا پتہ چلا تو وہ کاروبار چھوڑ کر بستی کی جانب بھاگے اور پولیس کے دستہ پر جوشِ غیرت میں ٹوٹ پڑے۔ فریقین کی طرف سے لاٹھیوں اور پتھروں کا تبادلہ ہوا۔ پولیس کا ایک شخص اس حادثے میں مارا گیا اور پولیس کے باقی افراد نے راہ فرار اختیار کر لی۔ کسانوں کا جتھہ آمریت مُردہ باد کے نعرے لگاتا ہوا بستی میں لوٹ آیا۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ پولیس نے فوج کی مدد طلب کر لی ہے اور توپوں سے بستی کا محاصرہ ہو رہا ہے تو کسانوں نے بھی اپنے اردگرد دفاعی تدابیر کھڑی کر لیں۔ مگر فوج کی گولہ باری سے بستی کی بنیادیں ہل گئیں۔ متعدد افراد مارے گئے اور جو بچے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کے گھروں کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ سوئٹزرلینڈ کے اخبار "ایبر ٹیٹ" نے اپنی ۱۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں اس خبر کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "کرداسہ کی بستی نے عبدالناصر کی فوجوں کا ہتھیاروں سے مقابلہ کیا ہے جو اخوان المسلمون کے ایک آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے بستی پر حملہ آور ہو رہی تھیں"۔

دوسرا حادثہ دمیاط میں پیش آیا جو بحر روم کے ساحل پر قاہرہ سے مشرق کی جانب ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اخوان کی تلاش میں پولیس کے دستے اس قصبے میں پہنچے۔ یہاں پولیس نے ایک ماہی گیر کی کشتی کی تلاشی لینا چاہی، لیکن اُس نے اس خوف سے لیت و لعل کی کہ پولیس

کے لوگ اُس کی شکار کردہ مچھلی پر ہاتھ صاف کریں گے۔ اس مچھیرے کی یہ جسارت پولیس کی شانِ استکبار کے منافی تھی۔ پولیس نے اُس کو بلا تردّد گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اُس کے ماہی گیر ساتھیوں نے جب تشدد کی یہ انتہا دیکھی تو انہوں نے واویلا مچایا اور نواحی آبادیوں کے لوگ مچھیروں کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔ آناً فاناً سینکڑوں افراد جمع ہو گئے۔ غریب مچھیرے کی بے بسی سے متاثر ہو کر انہوں نے دمیاط کے اندر پولیس اور حکومت کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے اور حکامِ مصر کے نام لے لے کر مُردہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔ مصری بیدروں کی دکانوں پر لٹکی ہوئی تصاویر کو جوشِ غضب میں زمین پر پھینکتے اور پاؤں تلے روندتے چلے گئے۔ علاقہ کے افسرِ اعلیٰ نے حکامِ بالا سے ربط قائم کیا اور "بغاوت" کو کچلنے کے لیے فوج کی مدد طلب کی۔ چنانچہ مصری فوج نے چڑھائی کی اور دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قاہرہ کے اخبارات نے اس واقعہ کو ۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعتوں میں ایک ہنگامہ اور پولیس کی مڈبھیڑ کی حیثیت سے بیان کیا۔ مگر "جوائنٹ پریس نیوز ایجنسی آف امریکہ" کی اطلاع کے مطابق اس قصبے کے کم از کم ۱۶ افراد مارے گئے اور مارشل عبدالحکیم عامر نے ذاتی طور پر اس میں دلچسپی لی۔ یونائیٹڈ پریس آف امریکہ نے بتایا کہ مرنے والوں کو تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کیے بغیر ہی دفن کیا گیا۔ اور فوج نے ہزاروں افراد کو حراست میں لے لیا۔ رائٹر اور ایجنسی فرانس نے اس واقعہ کو بڑی اہمیت سے نشر کیا

اب تک کی اطلاعات کے مطابق دسمبر ۱۹۶۵ء کے آخر تک اخوان کے چالیس ہزار سے زائد افراد گرفتار کیے گئے ہیں۔ لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے اپنی ۱۱ اکتوبر ۶۵ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "اب تک بیس ہزار افراد گرفتار کیے جا چکے ہیں اور ابھی تک پورے ملک میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری ہے"۔ گرفتار شدگان میں آٹھ سو کے قریب عورتیں ہیں۔ مزید برآں یہ کہ گرفتار شدگان کے خاندانوں کو ملک کے دُور دراز مقامات میں جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ لندن کے ایک یہودی اخبار جیوش آبزرور نے دلی مسرت کے ساتھ اپنی ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء

کی اشاعت میں یہ "خوشخبری" سنائی تھی کہ" اس ہفتے کی خبروں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ گرفتار شدہ اخوانیوں کے چار ہزار پانچ سو خاندانوں کو دُور افتادہ مقامات میں جلا وطن کر دیا گیا ہے:
مصر کے سرکاری حلقوں کے بیانات کے مطابق گرفتار شدگان دو گروہوں پر مشتمل ہیں۔ کچھ افراد وہ ہیں جن پر مصری حکومت کی طرف سے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ ان کی تعداد چار سو سے کم ہے۔ اور اکثریت ان لوگوں کی ہے جن پر کوئی الزام نہیں ہے۔

گرفتار ہونے والوں میں نمایاں شخصیتیں یہ ہیں:

۱۔ حسن اسماعیل الھضیبی۔ موصوف کی عمر ۷۴ برس کے لگ بھگ ہے۔ اخوان سے باقاعدہ تعلق سے پہلے قاہرہ کے سپریم کورٹ میں لیگل ایڈوائزر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں حسن البنا مرحوم کی شہادت کے بعد اخوان کے مرشد عام (صدر) منتخب ہوئے۔ موصوف چونکہ قانون دان ہیں اس لیے انہوں نے اپنے دورِ صدارت میں جماعت کو قانون اور ضابطے کا پابند بنانے میں بڑی کوشش کی ہے۔ بلکہ موصوف بعض اخوانی حلقوں میں اپنے قانونی تشدد اور خوردہ گیری کی وجہ سے تنقید کا ہدف بھی بنے رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب اخوان پر دوبارہ آزمائش آئی تو انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا اور انہیں سزائے موت سنائی گئی جسے بعد میں عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ جیل میں ان کو سخت تعذیب دی گئی جس کی وجہ سے ان کی صحت اس حد تک خراب ہو گئی کہ حکومت کو مجبوراً انہیں رہا کرنا پڑا۔ اس کے بعد سے یہ اپنے گھر پر نظر بندی کے ایام گزار رہے تھے۔ اب انہیں دوبارہ سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور ۳ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

۲۔ مامون الھضیبی۔ یہ حسن الھضیبی کے صاحبزادے ہیں اور قاہرہ کے سپریم کورٹ میں یہ بھی لیگل ایڈوائزر رہ چکے ہیں۔ انہیں ۳ سال کی سزا دی گئی ہے

۳۔ اسماعیل الھضیبی۔ یہ حسن الھضیبی کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ وکالت ان کا پیشہ ہے۔ انہیں ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔

۴۔ سید قطب۔ ان کی عمر ۶۰ سال کے قریب ہے۔ اخوان کے ساتھ وابستگی سے پہلے

پہلے وہ وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز کے منصب پر فائز تھے۔ ۱۹۵۲ء میں اخوان کے باضابطہ ممبر بنے۔ اور اخوان کے شعبہ نشر و اشاعت کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یہ بھی گرفتار ہوئے اور محکمۂ انتخاب (قومی عدالت) کی طرف سے انہیں موت کی سزا دی گئی جو عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ اگست ۱۹۶۴ء میں عبد السلام عارف مرحوم کی سفارش کی بنا پر حکومتِ مصر نے انہیں رہا کر دیا مگر ایک ہی سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور اب ان کو پھانسی پڑھا دیا گیا ہے۔

۵۔ محمد قطب۔ یہ سید قطب کے بڑے بھائی ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اخوان سے ان کا باقاعدہ تعلق نہیں ہے۔ ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔ الانسان بین المادیۃ والاسلام (انسان مادیت اور اسلام کی نگاہ میں)، شبہات حول الاسلام (اسلام پر مغرب کے اعتراضات اور ان کا جواب) جاہلیۃ القرن العشرین (بیسویں صدی کی جاہلیت)۔ ان کتابوں کی بے پناہ مقبولیت ان کی گرفتاری کا سبب ہوئی۔ انہوں نے اپنا ایک مکتبہ بھی قائم کر رکھا تھا جو ان کی کتابیں اور سید قطب اور دوسرے اسلام پسند مصنفین کی کتابیں شائع کرتا رہا ہے۔ ان کی گرفتاری کے وقت ان کا مکتبہ بھی ضبط کر لیا گیا ہے۔ محمد قطب جیل میں تعذیب کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکے ہیں! اخبار اسکاٹسمین نے ۵ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں اس خبر کی توثیق کی ہے۔ یہی حال موصوف کی بہن امینہ قطب کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ بھی تعذیب کی شدت سے شہادت پا چکی ہیں۔

۶۔ استاذ صالح ابوزقیق۔ یہ عرب لیگ کے مرکز میں لیگل ایڈوائزر رہ چکے ہیں۔

۷۔ محمد فرید عبد الخالق۔ مصر کے مشہور ماہرین تعلیم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

۸۔ استاذ منیر دلہ۔ فاروق کے عہد میں یہ کونسل آف سٹیٹ کے لیگل ایڈوائزر تھے گرفتار ہوئے۔ اِن عورتوں میں قابلِ ذکر خواتین یہ ہیں:

۱۔ سیدہ زینب الغزالی۔ ان کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہے۔ مسلم خواتین کی تنظیم کی سربراہ تھیں۔ انہوں نے ٹربیونل کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ "میرے اوپر جھوٹے الزامات

لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر میری بات کی ضرورت ہے تو وہ یہ ہے کہ انہیں دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

۲۔ حسن الہضیبی صدر اخوان کی اہلیہ۔

۳۔ حسن الہضیبی کی صاحبزادی سیدہ خالدہ

۴۔ اسماعیل الہضیبی کی اہلیہ (حسن الہضیبی کی بہو)

۵۔ سیدہ حمیدہ قطب۔ سید قطب کی بہن۔ انہیں ۱۰ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے

۶۔ استاذ عبدالحلیم وشاحی کی اہلیہ۔

گرفتار شدگان کے ساتھ جیلوں میں جو سلوک روا رکھا گیا ہے، اُن کے متعلقین کے ساتھ جو کچھ بیتی ہے اُس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اوپر ہم بیان کر آئے ہیں کہ گرفتار شدگان کے خاندانوں کی کثیر تعداد کو دُور افتادہ مقامات پر بھیج دیا گیا تاکہ وہ کسی قسم کی چارہ جوئی نہ کر سکیں اور عوام کی ہمدردیوں سے بھی محروم رہیں۔ گرفتار شدہ افراد کے خاندان کے لوگوں کو اپنے رشتہ دار قیدیوں سے ملاقات یا خط و کتابت کی اجازت نہیں دی گئی۔ اکثر لوگوں کو ایسی حالت میں گرفتار (دوسرے لفظوں میں، اغوا) کیا گیا ہے کہ ان کے متعلقین کو ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ ہزاروں خاندان ایسے ہیں جن کا کوئی سربراہ یا پُرسانِ حال نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ حکومت کے ایک قانون کی رُو سے گرفتار شدگان میں جو سرکاری ملازمین تھے ان کو تنخواہوں اور دوسرے قانونی استحقاقات سے محروم کر دیا گیا ہے۔

تمام پرائیویٹ کمپنیوں اور فرموں کے نام بھی فرمان جاری کر دیا گیا ہے کہ اگر گرفتار شدہ افراد میں سے کوئی فرد اُن کا ملازم ہے تو اُسے ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور اُس کی تنخواہ بند کر دی جائے اور اُس کے اقارب میں سے کسی کی مالی امداد نہ کی جائے۔ عام لوگوں کو بھی عملاً گرفتار شدگان کے متعلقین میں سے کسی کی نقد یا کسی اور شکل میں امداد کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو مستوجب سزا قرار دیا گیا ہے۔ گرفتار شدگان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو ضبط کر لیا گیا ہے۔ پیرس کے اخبار لوموند کے ۲۳۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ "حکومت مصر

کے ایک جاری کردہ قانون کی رُو سے حکومت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ سیاسی نظر بندوں کی املاک ضبط کر سکتی ہے۔" وہ خاندان جو کرایہ پر یا سرکاری مکانات میں رہتے تھے پولیس کے اشارے پر انہیں اُن مکانات سے نکال دیا گیا اور انہیں بے یار و مددگار کھُلے آسمان کے نیچے چھوڑ دیا گیا۔

چونکہ ان گرفتاریوں کے پیچھے کمیونسٹ عناصر اور کمیونسٹ مشیروں کا منصوبہ کام کر رہا ہے اس لیے یہ گرفتاریاں صرف اخوان تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ دراصل ان تمام تشددانہ کارروائیوں کا ہدف دو چیزیں ہیں۔ ایک "رجعت پسند" اہلِ قلم اور اہلِ دعوت کا وجود۔ دوسرے "رجعت پسندانہ" افکار و نظریات"۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک ان دونوں چیزوں سے ملک کی تطہیر نہیں ہوگی کمیونزم کو ملک میں اثر و رسوخ نہیں مل سکتی۔

"رجعت پسند" اہلِ قلم اور اہل دعوت کا صفایا کرنے کے لیے پہلا حملہ اخوان پر کیا گیا۔ اس کے بعد مصر کی دوسری مذہبی جماعتوں کی طرف رُخ کیا گیا اور اُن میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی حیثیت سے شریکِ سازش ثابت کیا گیا۔ انجمن سیدنا شباب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جمعیت شرعیہ، تبلیغی جماعت اور انصار السنۃ المحمدیہ کا اخوان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر جماعتیں اخوان سے شدید اختلاف رکھتی ہیں اور سیاست کو "شجرۂ ممنوعہ" سمجھتی ہیں۔ مگر ان سب جماعتوں پر حملہ کیا گیا، ان کے حامیوں کو گرفتار کیا گیا۔ اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ اخوان کے لوگ ان جمعیتوں کے نوجوانوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنے حلقۂ اثر میں لے آتے ہیں۔ اسیوط کی آبادی کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ وہاں کی مُسلم اقلیت کے لیے جمعیت شرعیہ نے ایک مسجد تعمیر کی اور مسجد کے ساتھ نوجوانوں کے لیے کھیلوں کا ایک کلب قائم کیا۔ جو نوجوان اس کلب میں تفریح کے لیے آتے رہے ہیں انہیں بھی گرفتار کیا گیا کیونکہ وہ ایسے کلب میں جاتے ہیں جس کا انتظام ایک مذہبی انجمن کے ہاتھ میں ہے۔

"رجعت پسندانہ" افکار سے نجات حاصل کرنے کے لیے مکتبوں پر چھاپے مارے گئے اور وہ تمام کتابیں ضبط کر لی گئیں جن میں یہ "جراثیم" پائے گئے۔ ہمارے سامنے ان کتابوں کی طویل

فہرست موجود ہے جو مصر میں پچھلے چند ماہ میں خلافِ قانون قرار دی گئی ہیں۔ ان میں اخوان مصنفین کے علاوہ دوسرے اُن مصنفوں تک کی کتابیں شامل ہیں جو سرکار دربار میں منظورِ نظر رہے ہیں۔ ان مطابع کو سر بمہر کر دیا گیا ہے جو بالعموم اسلامی لٹریچر چھاپتے ہیں۔ المدنی پریس قاہرہ کا مشہور پریس ہے۔ راقم السطور کی ملاقات اس پریس کے مالک محمد المدنی سے قطر میں ہوئی ہے۔ انہوں نے خود مجھے اپنے پریس کی تباہی کی داستان سُنائی اور بتایا کہ یہ تباہی محض اس جرم میں ہوئی کہ یہ پریس کمیونسٹ لٹریچر چھاپنے کے بجائے اسلامی لٹریچر چھاپتا رہا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ کشمکش دراصل اسلام اور کمیونزم، اور خدا پرستی اور الحاد کی کشمکش ہے۔ اسے محض چند افراد کے "جنون" سے تعبیر کرنا اور اُن کی "سزائے موت" پر اس کا خاتمہ تصوّر کر لینا حالات کا صحیح مطالعہ نہیں ہے

اب اُن الزامات کو لیجیے جو سرکاری پریس نوٹ میں اخوان پر لگائے گئے ہیں۔

سب سے پہلا الزام یہ ہے کہ اخوان نے ایک خفیہ تنظیم قائم کر رکھی تھی جس کے سربراہ سید قطب تھے۔ یہ تنظیم ملزمین کے لیے مالی امداد اور دیگر وسائل فراہم کرتی تھی۔ صدر ناصر کے قتل کا منصوبہ تیار کر رہی تھی۔ کچھ نوجوانوں کو سرکاری عمارات اور اعلیٰ حکام کی اسپیشل ٹرینوں کو اڑانے کی تربیت دے رہی تھی۔ اور اس تربیت کے لیے بعض عورتوں کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے یہ کوئی نیا الزام نہیں ہے اور نہ تنہا مصری حکومت اور مصر کے اخوان المسلمون ہی کے لیے مخصوص ہے ہر صاحبِ اقتدار نے اپنے مخالفین پر ہر دَور میں ایسے ہی الزامات چسپاں کیے ہیں۔ خصوصاً کمیونسٹ ممالک اور ان کے زیرِ اثر ممالک تو اس طرح کے الزامات کی تصنیف میں بڑے چابکدست ثابت ہوئے ہیں۔ کیا یہ الزام صرف اس بنا پر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ سرکاری پریس نوٹ میں اسے بیان کر دیا گیا ہے؟ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ ۱۹۵۴ء سے اخوان کے ہزاروں افراد جیلوں میں پڑے ہیں۔ ان کے اہل و عیال انتہائی عسرت اور مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ خود سید قطب ۱۰ سال کے بعد رہا کیے گئے اور ایک ہی سال کے وقفے سے انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے ایام میں بھی اُن کی شدید نگرانی کی جاتی رہی ہے۔ کیا عقل یہ باور کرتی ہے کہ انہوں نے

اس قلیل وقفے میں اتنی بڑی سازش تیار کرلی اور اس کے لیے اس قدر کثیر مقدار میں اسلحہ بھی فراہم کرلیا کہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں جس حکومت کی پولیس روم سے مشتبہ اشخاص کو صندوق میں پیک کرکے قاہرہ لانے کا انتظام کرسکتی ہے کیا اُس پولیس کی موجودگی میں کوئی شخص ایسی سازش کا خیال بھی دل میں لا سکتا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ فردِ جرم میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "ملزمین ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۵ء تک برابر حکومت کا تختہ اُلٹنے کی اسکیم تیار کرتے رہے" گویا سید قطب جیل میں بیٹھ کر اس اسکیم کی نگرانی کرتے رہے اور اپنی ہمشیرگان اور ایک ۶۰ سالہ خاتون زینب الغزالی سے اس اسکیم کے نفاذ کی ہدایات تقسیم کرنے کی خدمات لیتے تھے! پھر آخر اس الزام کا ثبوت کیا ہے؟ ریڈیو اور پریس کا پروپیگنڈا تو کوئی ثبوت نہیں ہے، اور جس طرح کی عدالت میں جس ڈھنگ سے اس کو پیش کیا گیا ہے اُس کا بھانڈا دنیا کے ایک غیر جانبدار ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے پھوڑ دیا ہے۔

البتہ اخوان نے پچھلے چند سالوں میں ایک کام ضرور کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ۵۴ء سے جو ہزاروں افراد جیلوں میں پڑے ہیں اُن کے لاوارث اور بے کس اہل و عیال کی مالی اعانت شروع کی ہے۔ مصری حکومت اپنی خفیہ پولیس، اپنی پروپیگنڈا مشینری، اور عرب سوشلسٹ پارٹی اور اس نوعیت کے دوسرے اداروں پر تو بلاشبہ دولت کی بارش کرتی رہی ہے لیکن قیدیوں کے متعلقین کی گزر بسر کے لیے کبھی ایک پائی کی روادار بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اُس کا یہ فرض تھا کہ سیاسی انتقام کی بنا پر جن لوگوں کو طویل مدت کے لیے اُس نے جیلوں میں ڈال دیا تھا اُن کے معصوم بچوں، بیویوں اور بوڑھی ماؤں کو کم از کم بقدرِ سدِ رمق ہی مالی مدد دیتی۔ کیا مارکسزم میں ایسے لوگوں کے متعلقین کو فاقہ کشی سے بچانے کا کوئی اصول نہیں پایا جاتا؟ کیا مارکسزم میں صرف واحد حکمران پارٹی ہی کو مال و دولت سے جھولیاں بھرنے کی اجازت ہے، کوئی دوسرا اس کا مستحق نہیں ہے؟ کیا "شہید وطن" لومبا کے غیر مصری بچوں کو مصری حکومت کے زیرِ عاطفت تعلیم و تربیت کی پوری سہولتیں حاصل ہوسکتی ہیں، مگر عبدالقادر عودہ کے غریب اور نادار بچوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہے؟ آخر ہزاروں قیدیوں کے پیچھے لواحقین کی طویل فہرست تھی۔ اُن کی مائیں، اُن کی بیویاں، اُن کی بچیاں

ان کے شیر خوار بچے۔ کیا کسی نے سوچا کہ یہ مصیبت زدہ دو وقت کی روٹی کہاں سے کھاتے ہوں گے؟

لیکن مصر دردِ دل رکھنے والوں سے یکسر خالی نہیں ہے۔ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ وطالبات کا ایک گروہ اہل خیر کے گھروں میں جا کر اُن سے اعانتیں حاصل کرتا تھا اور حسبِ ضرورت ہر قیدی کے بے سہارا متعلقین تک پہنچاتا تھا۔ مصری حکومت نے اسی گروہ کو "خفیہ تنظیم" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ گروہ مصر کی خفیہ پولیس سے اوجھل نہیں تھا۔ یہ سب اخوانی بھی نہ تھے محض انسانی جذبے سے خدمتِ خلق سمجھتے ہوئے بہت سے نوجوان یہ کام کر رہے تھے۔ اور بہت سے نیک لوگ جن کا اخوان سے کبھی دُور دراز کا تعلق بھی نہ تھا، صرف خدا ترسی اور انسانی ہمدردی کی بنا پر اس کارِ خیر میں ان کی مالی مدد کر رہے تھے۔ کسی شریف آدمی کے تصور میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ بھی کوئی سیاسی سرگرمی ہے، اس لیے نہ انہوں نے اس کو چھپانے کی کوئی ضرورت محسوس کی اور نہ اس کے لیے کوئی "خفیہ نظام" قائم کیا۔ جو لوگ مصری حکام کے مزاج کو سمجھتے تھے انہوں نے ان نیک دل نوجوانوں کو اس کام سے باز رہنے کی تلقین بھی کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ "خدمتِ خلق" ایک دن اُن کے لیے تباہ کُن ثابت ہوگی مگر اُن کے دلوں پر اس تلقین کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر اپنے کام میں مگن رہے۔ آخر کار ان کی خوش طبعی ان کے لیے بلا ثابت ہوئی۔ وہ اپنا کام کرتے رہے اور مصری خفیہ پولیس خاموشی کے ساتھ ان کی فہرستیں تیار کرتی رہی۔ آج وہی اخوان کی "خفیہ تنظیم" کے کارکن قرار دیئے گئے اور بہت سے وہ نیک لوگ بھی جو فاقہ کش خاندانوں کی دستگیری کے لیے ان کو مالی مدد دیتے تھے "سازش" کے الزام میں دھر لیے گئے ہیں۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ اخوان کے پاس سے اسلحہ کے ذخائر برآمد ہوئے ہیں اور اس اسلحہ سے وہ مصر کی حکومت کا تختہ اُلٹنے اور نامور شخصیتوں کو مارنے اور بڑی بڑی عمارات کو اڑانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر اخبارات میں جس اسلحہ کی تصویریں شائع ہوئی ہیں وہ معمولی چھریاں اور کانٹے ہیں اگر فی الواقع پولیس نے اسلحہ برآمد کیا ہوتا تو یقیناً اُس کے لیے نمائشیں منعقد کی جاتیں اور ٹیلیویژن پر اُسے دکھا دکھا کر دنیا کو باور کرایا جاتا کہ مسلح انقلاب کے لیے یہ سر و سامان فراہم کیا گیا تھا۔

کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ برآمد شدہ اسلحہ تو چھپا کر رکھ لیے گئے اور دنیا کو دکھانے کے لیے اخبارات میں صرف چھریاں اور کانٹے پیش کر دیئے گئے؟ کیا مصری حکام نادان بچے ہیں کہ اصل میگزین جو انہوں نے پکڑے تھے انہیں پس پردہ رکھ کر نمائش کے لیے یہ سامانِ مضحکہ دنیا کے سامنے لے آئے؟

ایک مشہور صحافی جس نے مصر کا دورہ کیا ہے، اس کا بیان ہے کہ حکومت نے صحافیوں کی ایک پارٹی کو کرداسہ کی بستی میں جمع ہونے کی دعوت دی تاکہ انہیں اسلحہ کے ذخائر کا معاینہ کرایا جائے ایک طرف صحافیوں کی جماعت کو کرداسہ پہنچانے کا انتظام کیا گیا اور دوسری طرف فوج کی ایک گاڑی اسلحہ سے بھر کر کرداسہ روانہ کر دی گئی مگر اتفاق سے یہ گاڑی راستہ میں کسی وجہ سے خراب ہو گئی اور وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکی نتیجہ یہ ہوا کہ بیچاری پولیس کو اسلحہ کا گودام تیار کرنے کا موقع نہ مل سکا صحافیوں نے جب اسلحہ کے ذخائر دیکھنے کا مطالبہ کیا تو پولیس کو مجبوراً فوجی گاڑی کا معاینہ کرانا پڑا، اور اس نے بتایا کہ اسلحہ کے ذخائر سے مراد یہی گاڑی ہے۔ اس فوجی گاڑی کے علاوہ دوسرے اسلحہ کی اخبارات میں تصاویر تو ضرور دکھائی گئی ہیں مگر اسلحہ کے نمونے نہ کہیں پیش کیے گئے اور نہ عوام الناس کو ان کی زیارت کرائی گئی۔

ان دو بنیادی الزامات کے بعد وقتاً فوقتاً الزامات کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ سید قطب، محمد قطب، امینہ قطب، حمیدہ قطب یہ سب بھائی بہن دہشت پسند خفیہ تنظیم کے سربراہ ہیں، ان کی نگرانی میں وہ اسکیم تیار ہو رہی تھی جس کا اگر انکشاف نہ ہو جاتا تو مصر کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ ایک ہی گھرانے کے سگے بہن بھائی اتنی بڑی اسکیم کی نگرانی کر رہے ہوں، یہ احمقوں اور بیوقوفوں کا گھرانہ تو ہو سکتا ہے مگر "تفسیر قرآن"، "اسلام کے عدل اجتماعی" اور "انسان مادیت اور اسلام کی نظر میں" اور "زندگی کی راہیں" کے مصنفین کا گھرانہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ان لوگوں کا گھرانہ ہو سکتا ہے جس کا ایک فرد دس سال تک قید بامشقت گزار چکا ہو، اور جس کی ایک خاتون دس سال سے عمر قید کی سزا بھگتنے والے شوہر کے انتظار میں بیٹھی ہو۔

۲۔ حسین توفیق نامی ایک شخص کی سازش کا انکشاف کیا گیا۔ اگرچہ پولیس کی فائل اسے

اخوان کی سازش سے الگ سازش شمار کرتی ہے مگر مصری پریس اور اخبارات اسے اخوان ہی کی "سازش" کا ایک حصّہ قرار دیتے ہیں۔ پولیس کی فائل میں حسین توفیق کو سعودی عرب کی حکومت کا ایجنٹ قرار دیا گیا تھا۔ مگر سعودی عرب سے اس سازش کو منسوب کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ یمن کے مسئلے کو حل کرنے میں رکاوٹ پیش آسکتی ہے اور حکومتِ مصر کی اس وقت شدید خواہش ہے کہ یہ مسئلہ پُر امن طریق سے حل ہو جائے، اس لیے اس "سازش" کو سعودی عرب سے منسوب کرنے کے بجائے اخوان کے حساب میں ڈال دیا گیا۔ کیونکہ یہ لوگ قربانی کے ایسے بکرے ہیں جن کی کوئی ماں نہیں ہے جو اُن کی خیر منا سکتی ہو۔

۳۔ کچھ مدت کے بعد یہ الزام شائع کیا گیا کہ اخوان کی دہشت پسند تنظیم نہ صرف صدر ناصر کے قتل کا منصوبہ تیار کر رہی تھی بلکہ ملکۂ ترنم اُمّ کلثوم، مشہور موسیقار عبدالوہاب، نامور فلم ایکٹر عبدالحلیم حافظ، اور فلمی دنیا کے تابندہ ستارے نائزہ اور شادیہ کا قتل بھی اُن کی اسکیم میں شامل تھا۔ ان ناموں کے اعلان سے پولیس کا مقصد یہ تھا کہ اگر عوام الناس اپنے محبوب صدر کے قتل کی سازش کا انکشاف سُن کر نہ بھڑکیں گے تو کم از کم اپنے محبوب ہیروؤں کے لیے تو اُن کے دل میں جوش و حمیّت کا اُبھر آنا یقینی ہے۔ اور اس واقعہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب مذکورہ اربابِ غنا و رقص کے نام اخبارات میں شائع ہوئے تو ان کے دوسرے ہم جنسوں نے اس پر احتجاج کیا کہ انہیں ہیروؤں کی صف میں شمار کیوں نہیں کیا گیا۔ پولیس نے ان کے اس مطالبے کے بعد کچھ اور ایسے "خطوط" برآمد کر لیے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ مذکورین کے علاوہ اور لوگوں کی کثیر تعداد بھی اخوان کی فہرست میں شامل تھی۔ ان کے نام بھی اخبارات میں شائع کر دیئے گئے۔

۴۔ پریس نوٹ میں کچھ عرصہ بعد یہ اضافہ کیا گیا کہ اخوان کے پاس سے جو اسلحہ برآمد ہوا ہے وہ انہیں سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (سنٹو) کی طرف سے ملا ہے۔ یہ درحقیقت پاکستان، ایران اور ٹرکی پر ایک تہمت ہے۔ اس سے مصری حکومت یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ یہ ملک چونکہ مصر کے

خلاف سازشوں میں شریک ہیں اس لیے حکومتِ مصر مسئلۂ کشمیر میں پاکستان کے بجائے ہندوستان سے ہمدردی رکھنے اور مسئلۂ قبرص میں ترکی کے بجائے مکاریوس سے تعاون کرنے میں حق بجانب ہے۔

اس تہمت کے اختراع کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پاک بھارت جنگ کے دوران حکومت مصر نے پاکستان کے معاملے میں پوری عرب قوم کے اجماع سے ہٹ کر جو رویہ اختیار کیا تھا اس پر مصری عوام مطمئن نہیں تھے اور مصر کے اندر بھی اور مصر کے باہر بھی حکومتِ مصر کو اس غلط فیصلے پر ہدفِ تنقید بننا پڑا تھا آخر کار اپنے غلط موقف کے لیے وجہِ جواز کے طور پر یہ افسانہ تراشا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جن افراد کو موت کی سزا دی گئی ہے یا دوسری بڑی سزائیں دی گئی ہیں انہوں نے اپنے جرم کا خود اقبال کیا ہے۔ آمرانہ نظام کے اندر "اقبالِ جرم" کا افسانہ کسی دلیل و تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ اسٹالین کے دور میں اقبالی مجرموں کی داستانوں سے ایک دنیا واقف ہو چکی ہے۔ ہر انسان کی قوتِ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد سے زیادہ اسے اذیت پہنچا کر ہر نا کردہ گناہ کا اس سے اقبال کرایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ جس "عدالت" کے سامنے یہ ملزم پیش کیے گئے اس میں مقدمے کی سماعت کا جب آغاز ہوا تو کارروائی کو ٹیلیویژن پر دکھایا گیا۔ اور جب نظر بندوں نے اپنی تعذیب کی داستانیں سنانی شروع کیں تو یہ کارروائی فوراً روک دی گئی اور اُسے بند کمرے میں شروع کر دیا گیا۔ مصری یا غیر مصری صحافیوں کو بھی کارروائی کی سماعت کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے نے کورٹ میں داخل ہونا چاہا تو اسے بھی منع کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد کورٹ کی کارروائیوں کی جتنی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں وہ صرف سرکاری ذرائع سے شائع ہوئیں۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اخوان کے نظر بندوں نے جرم کا اقبال کر لیا ہے تو ہمارے نزدیک یہ کوئی امرِ محال نہیں ہے۔ اُن کے ساتھ جیلوں میں جو برتاؤ کیا گیا ہے اُس کے پیشِ نظر کسی محبوس کا ان تمام کے تمام الزامات کی تصدیق کر دینا جو سرکاری پریس نوٹ میں بیان کیے گئے ہیں ناقابلِ فہم نہیں ہے۔ جس برتاؤ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ عرب ممالک کے اخبارات میں چھپ چکا

ہے - ریڈ کراس جینوا کا ادارہ اس کا اظہار کر چکا ہے ، ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمایندے کی رپورٹ میں اس کی تائید کی جا چکی ہے ، اور سب سے بڑھکر یہ کہ عرب ممالک کے بچّے بچّے کی زبان سے یہ حقیقت دُہرائی جا رہی ہے

ہم یہاں صرف مصر کے سجن حربی (فوجی قید خانے) کے حالات بیان کرتے ہیں جس میں وہ لوگ رکھے جاتے ہیں جن کا انٹیروگیشن کیا جاتا ہے - وہاں اخوان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اُس کی حسب ذیل تفصیلات روزنامہ "المیثاق الاسلامی"، خرطوم ، سوڈان - شمارہ بابت ۲ وسیم فروری ۱۹۶۶ء ، روزنامہ "العلم"، رباط ، مراکش شمارہ بابت ۲ مارچ ۱۹۶۶ء ، اور روزنامہ "عکاظ" جدّہ سعودی عرب شمارہ بابت یکم مئی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہیں - یہ اُن قیدیوں کے بیانات ہیں جو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھیوں پر گزرے ہوئے حالات باہر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے اور پھر یہ بیانات سوڈان ، مراکش اور سعودی عرب کے اخبارات تک پہنچ گئے :

" ۳۰ کے قریب اخوان کا ایک گروپ لایا گیا - انہیں تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا - ہر ایک کی ٹانگ دوسرے کے بازو سے باندھ دی گئی اور زمین پر چت لٹا دیا گیا - اس کے بعد دس کرین منگوائے گئے - پہلے شخص کے دونوں بازو نمبر ۱ کرین کے ساتھ باندھ دیئے گئے - تیسرے شخص کی دونوں پنڈلیوں کو نمبر ۲ کرین کے ساتھ باندھ دیا گیا - اس طرح ان دس کرینوں نے ۳۰ افراد کو فضا میں ٹکا دیا - یہ کرین پانچ قطاروں میں تھے - اس کے بعد دوسرے نظر بندوں کو لا کر کرینوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا اور ام کلثوم کے گانوں کے ریکارڈ لگا دیئے گئے جن میں یہ گانا خاص طور پر دہرایا گیا : " یا جمال ، یا مثال الوطنیۃ " - اخوان کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی اس گانے کو دہرائیں - ایک گھنٹہ تک یہ گانا دہرایا جاتا رہا - اس کے بعد داروغۂ جیل حمزہ بسیونی اور اُس کے اسسٹنٹ حسین عرفہ اور دوسرے فوجی افسر آئے - اُن کے آگے آگے حسن الہُضَیبی اور سید قطب کو اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا - یہ دونوں نیم مُردہ حالت میں تھے اور چل نہیں سکتے تھے - کرینوں پر ٹنگے ہوئے ساتھیوں کے سامنے انہیں کھڑا کر دیا گیا - فوجی افسر نے ٹنگے ہوئے ساتھی سے پوچھا : " کیا تجھے اپنا بیان یاد

ہے ؟" اُس نے جواب دیا : ہاں - پھر پوچھا : "جو باتیں تجھے لکھ کر دی گئی ہیں وہ اچھی طرح یاد ہیں ؟" ساتھی نے کہا : ہاں ، خوب یاد ہیں " ہر شخص سے یہی سوالات کیے گئے - پھر پوچھا گیا :" کیا تم عدالت میں ان بیانات کو بدل دو گے ؟" ساتھیوں نے جواب دیا : نہیں - سوال ہُوا : " جیل میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا ہے " جواب ملا : " بڑا شریفانہ اور مشفقانہ برتاؤ ہُوا ہے " فوجی افسر نے حسن الھضیبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا : یہ کون ہے ؟ ساتھی نے کہا : جناب مُرشد ہیں (اخوان اپنے صدر کو مُرشد کہتے ہیں) ، فوجی افسر نے کہا : کہو " مرشد کفر" ساتھی نے کہا " مُرشد کفر " سید قطب کی جانب اشارہ کر کے فوجی افسر نے پوچھا : " یہ کون ہے " ، ساتھی نے کہا : " سید قطب " کہا گیا " اسے مخاطب کر کے کہو : " تو بڑا ظالم اور نادان ہے " ساتھی نے ان الفاظ کو دہرا دیا - یہ سوال وجواب ہر متعلق ساتھی سے کئے گئے - ایسا بھی ہوا کہ ایک ساتھی نے جواب نہ دیا اور خاموشی اختیار کر لی - مگر فوجی افسر نے جلتا ہوا سگریٹ اس کے نازک اعضاء پر لگایا اور وہ بے اختیار پکار اٹھا : " یہ مُرشد کفر ہے اور وہ ظالم اور نادان ہے "

" اس کارروائی کے بعد داروغہ جیل حمزہ بسیونی نے تقریر شروع کی اور کہا : ہم پہلے " سبق " دیتے ہیں اور جو شخص " سبق " یاد نہ کرے یا یاد کر کے بھلا دے اس کو کرینوں کے ذریعہ چیر ڈالا جائے گا اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہونگے - یہ کرین کھڑے ہیں - جو چون وچرا کرے گا اس کی دونوں ٹانگیں دو کرینوں کے ساتھ باندھ دیں گے اور دونوں کو مخالف سمتوں میں حرکت دیں گے - اس طرح اس کی ٹانگیں الگ الگ کر دیں گے - ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے - ہم جانتے ہیں کہ تمہیں مرنے کی بڑی آرزو ہے - لیکن ہم اس آرزو کو پورا نہیں کریں گے " (۱۲ دسمبر ۶۵ء کے واقعات)

" اس جیل میں پانچ خواتین دماغی حادثہ کی شکار ہوگئیں تقریباً ایک ہفتہ سے وہ حواس باختہ ہیں ایک فوجی افسر آیا اور ان خواتین سے کہنے لگا کہ کیا تمہاری دماغی حالت خراب ہو گئی ہے ؟ میں اسے باور نہیں کرتا - میں ابھی تمہاری دماغی خرابی کو بحال کرتا ہوں " یہ کہہ کر وہ ان بے چاریوں کو شدید اذیت دینے لگا اور انہیں اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ آج تک حواس باختہ ہیں " (واقعہ یکم رمضان مطابق ۲۴ دسمبر ۶۵ء)

" ایک خاتون جو بڑی صاحب علم وفضل ہیں اور تبلیغ کے میدان میں بڑی سرگرم رہی ہیں ، اُنکے

بھائی کو اس جیل میں لایا گیا ہے اور ۲۰ روز تک مسلسل انہیں اذیت دی گئی ہے اور انہیں مجبور کیا گیا ہے کہ وہ یہ تحریر لکھ دیں کہ ان کی بہن جو اس وقت نظر بند ہے، بدکار عورت ہے اور پیشہ کرتی ہے۔ مگر وہ یہ تحریر لکھنے سے انکار کر رہے ہیں۔ ان کی حالت ابتر ہو چکی ہے۔ ان کی بہن (خدا اُسے سرخرو رکھے) کئی مرتبہ اُن سے یہ درخواست کر چکی ہے کہ آپ یہ تحریر لکھ دیں اور عذاب سے اپنی جان چھڑا لیں مگر وہ نہیں مانتے اور بہن سے کہتے ہیں کہ تم میرے لیے بہترین نمونہ بنی ہو، میں انشاء اللہ تمہارے لیے نمونہ بنوں گا۔"

"فوجی قید خانے میں نظر بند خواتین کی تعداد ۶۳ تک پہنچ گئی ہے۔ احاطہ نمبر ۴ میں مختلف اوقات میں اُن کی چیخیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔"

"شوقی عبدالعظیم کوٹھری ۴ کی چھت میں یکم رمضان سے سر کے بل روزانہ لٹکائے جا رہے ہیں۔ بالکل برہنہ جسم ہیں۔ چھت پر ایک ٹونٹی لگی ہوئی ہے جس سے پٹرول کے قطرے ٹپکتے ہیں اور شوقی کے سر پر گرتے ہیں۔ اس سے اُن کا سانس گھٹتا رہتا ہے۔ یہ عمل روزانہ ۵ گھنٹے جاری رہتا ہے۔ داروغۂ جیل بار بار آ کر اُن سے پوچھتا ہے کہ "کیا تم ابھی تک پکے مومن ہو؟" شوقی جواب میں کہتا ہے: "اے اللہ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو پھر ان مصائب کی مجھے پروا نہیں"۔ یہ سُن کر داروغۂ جیل غصے میں آ کر اُن کے جسم میں سگرٹ بجھاتا ہے اور انہیں کوڑے مارتا ہے۔ ایک رفیق نے موقع پا کر شوقی سے کہا کہ "کم از کم خاموش ہی رہا کریں"۔ مگر شوقی نے جواب میں کہا: "لاحول ولا قوۃ الا باللہ"

"۲۵ دسمبر ۶۵ء کو حسب معمول تعذیب کے لیے پریڈ ہوئی جسے جیل کی اصطلاح میں (BRAIN WASHING) کہتے ہیں۔ آج تین تعلیم یافتہ خواتین کو بھی لایا گیا۔ ہر خاتون ایک چوبی ٹکٹکی سے کسی ہوئی تھی۔ تینوں خواتین نیم عریاں حالت میں تھیں۔ اور خون اور پیپ سے اُن کا جسم لت پت تھا۔ صف میں سے قاہرہ کے ایک اخوانی انجینئر محمود عزت اپنی قمیص اتار کر تیزی سے آگے بڑھے اور ایک خاتون کی ستر پوشی کرنا چاہی۔ مگر یکایک ایک فائر ہوا اور

محمود عزت زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ باقی لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے کپڑے اتار لیں اور مادر زاد ننگے ہو جائیں اور اپنے ہاتھ کندھوں تک اٹھائے رکھیں۔ یہ لوگ کئی گھنٹہ اسی حالت میں کھڑے رہے اور جب واپس کوٹھڑیوں میں آئے تو ان کے جسم چکنا چور تھے۔ اس پریڈ کو جیل کی اصطلاح میں ایئر فورس کہا جاتا ہے۔

"استاد منیر دلہ (جو فاروق کے عہد میں کونسل آف اسٹیٹ کے قانونی مشیر رہ چکے ہیں) کو دل کے دورے پڑ رہے ہیں۔ ان کی حالت بہت نازک ہے اس کے باوجود انہیں کوڑے مار مار کر پریڈ میں شامل کیا جاتا ہے۔"

"صالح ابو رقیق (عرب لیگ کے سابق قانونی مشیر) کے بارے میں ہدایات جاری ہوئی ہیں کہ ان کی خبر دوسروں سے زیادہ لی جائے۔"

"نظر بندوں کو ننگا کرنا، انہیں لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر ان پر کتے چھوڑنا، جلتی ہوئی آگ میں انہیں پھینکنا، بھائیوں کے سامنے بہنوں کو برہنہ کر دینا، مسلسل بھوکا رکھنا، بجلی کے جھٹکے دینا، نیند سے محروم رکھنا، یہ اذیت کے عام طریقے ہیں جو نظر بندوں پر استعمال کیے گئے ہیں۔"

اور یہ طریقے ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیے گئے ہیں جو معمولی نوعیت کے آدمی نہیں ہیں بلکہ خود سرکاری پریس نوٹ کے مطابق ان میں ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، پروفیسر، ادیب، عالم، ٹکنیک، تاجر اور سرکاری ملازم کثیر تعداد میں ہیں۔ ہم نے جو تعذیبی کارروائیاں اخبارات سے نقل کی ہیں وہ چند مثالیں ہیں، ورنہ ان کارروائیوں کی طویل فہرست ہمارے سامنے ہے۔ لبنان کا ایک عیسائی روکس معکرون جو اس زمانہ میں مصر کی جیل میں تھا اور بعد میں رہا ہو کر آیا۔ ان مظالم کو دیکھ دیکھ کر صبر نہ کر سکا اور اس نے آزاد فضا میں پہنچ کر ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان ہے: "اقسمت ان اروی" (میں نے قسم کھائی ہے کہ یہ حالات بیان کروں گا) اس پمفلٹ کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ملزموں نے خود اقبال جرم کر لیا ہے دنیا اس قدر بیوقوف نہیں ہے کہ اس دعوے کو من وعن قبول کرے۔ عدالتی

کارروائی کا بھی جو ڈرامہ کھیلا گیا ہے اسے ایمنسٹی انٹرنیشنل کا تبصرہ واضح کر چکا ہے۔ عام ملکی عدالتوں کے بجائے فوجی ارکان پر مشتمل خاص ٹریبونل تشکیل دینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ملک کی عام عدالتوں پر اعتماد نہیں تھا؟ نظر بندوں کو کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا موقع کیوں نہیں دیا گیا؟ بند کمرے میں کیوں سماعت کی گئی؟ عام سامعین کو اور اخباری نمائندوں کو داخل ہونے سے کیوں روکا گیا؟ سوڈانی وکلاء کو پیروی کی اجازت دینے سے کیوں انکار کیا گیا؟ اس یک طرفہ کارروائی کے ذریعہ سے اپنے ہی ملک کی قیمتی جانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ فانتظروا انا معکم منتظرون۔

مطبوعات

تاریخ التفسیر مصنف: جناب عبدالصمد صارم الازہری۔ ناشر: ادارۂ علمیہ دھنی رام روڈ نئی انارکلی لاہور ضخامت: ۱۶۰ صفحات۔ قیمت: چھ روپے۔

جناب عبدالصمد صاحب صارم الازہری تعلیمی حلقوں کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ آپ نے طلبہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اب تک حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ موضوعات پر متعدد مفید کتابیں لکھی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "تاریخ التفسیر" بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں فاضل مصنف نے تفسیر، مفسرین، کتبِ تفاسیر اور تفسیری اصطلاحات پر اچھا مواد جمع کر دیا ہے۔

کتاب الزکاۃ مترجم: جناب غازی احمد صاحب۔ ناشر: المکتبۃ العلمیہ۔ ۱۵ لیک روڈ لاہور۔ ضخامت: ۱۲۰ صفحات قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے۔

یہ کتاب ہدایہ کی کتاب الزکاۃ کا اردو ترجمہ ہے۔ طلبہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ معیارِ کتابت و طباعت اچھا ہے۔

بدایۃ المجتہد (ترجمہ و تشریح) مصنف: جناب میاں محمد صاحب نوشہروی ناشر: ادارۂ عروجِ اسلام۔ حسنین آباد۔ وا لٹن۔ لاہور۔ ضخامت: ۴۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ

اس کتاب میں علامہ ابن رشد کی بدایۃ المجتہد کی کتاب الطہارۃ تا کتاب التیمم کا اردو ترجمہ اور تشریح جناب میاں محمد صاحب نوشہروی نے بدایۃ المعتقد کے نام سے کیا ہے۔ نصف صفحہ میں متن اور مقابل کے نصف میں ترجمہ ہے۔